مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۰ | جمادی الثانی سنہ ۱۴۴۰ھ | مارچ ۲۰۱۹ء | شمارہ ۳

القاف

ذکر کی اہمیت وافادیت

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

35422213
35433049

پتہ دفتر
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ اریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

القاف

(ذکر کی اہمیت وافادیت)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	وجہ تسمیہ	۹
۲.....	دعا خطبہ	۱۰
۳.....	کسی چیز کی خاصیت جاننے کا نفع	۱۰
۴.....	اعمال کے خواص جاننے کے فائدے	۱۱
۵.....	علم خاصیت ہر شخص کو مفید ہے	۱۲
۶.....	خیال مؤثر چیز ہے	۱۲
۷.....	مالیخولیا میں علاج سے کم نفع ہونے کا سبب	۱۳
۸.....	علم خاصیت میں دو حکمتیں	۱۴
۹.....	کیفیات وآثار پیدا ہونے کا سبب	۱۴
۱۰.....	مزاج میں لطافت کی زیادتی کا اثر	۱۵
۱۱.....	اعمال کی دو اقسام	۱۵
۱۲.....	بہت سی باتیں وراء العقل ہیں	۱۶
۱۳.....	عالم شریعت سے کسی کو حق مزاحمت نہیں ہے	۱۶
۱۴.....	طبیب باطنی کسی مرض کو لا علاج نہیں کہتا	۱۷
۱۵.....	دوسرے کے کام میں دخل دینا نقصان عقل کی بات نہیں ہے؟	۱۸
۱۶.....	علوم نبوت محفوظ ہیں	۱۹
۱۷.....	حق تعالیٰ شانہ سے احکام علل پوچھنے کی کسی کو مجال نہیں	۲۰
۱۸.....	ایک کاتب کا کارنامہ	۲۰
۱۹.....	بعض اعمال کے خواص کا عقل ادراک نہیں کرسکتی	۲۱
۲۰.....	علوم شرعیہ کو مدرک بالوحی مان لینے کا عظیم نفع	۲۲

۲۱..... عوام کی سستی اعمال کا سبب..... ۲۳

۲۲..... لا الہ الا اللہ سے مراد..... ۲۳

۲۳..... اردو ترجمہ از خود دیکھنے کی خرابیاں..... ۲۵

۲۴..... اعمال کو ضروری نہ سمجھنے کا الزامی جواب..... ۲۶

۲۵..... انبیاء علیہم السلام کا اصل کار منصبی دین ہے..... ۲۷

۲۶..... نبوت کا اصل کام سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام سے لیا گیا..... ۲۸

۲۷..... بعض انبیاء علیہم السلام کے تعلیم الصنائع کی وجہ..... ۲۸

۲۸..... مصلح کا اصل کام تعلیم دین ہے..... ۲۹

۲۹..... صنعت گری کا پہلا استاد کوا ہے..... ۳۰

۳۰..... کلمہ طیبہ کی فضیلت..... ۳۱

۳۱..... کلمہ طیبہ کے حصول خواص کی ضروری شرائط..... ۳۲

۳۲..... ہر عمل کے الگ الگ خواص..... ۳۳

۳۳..... علوم وحی میں تعارض نہیں ہوسکتا..... ۳۵

۳۴..... ذکر کی غرض دفع خطرات سمجھنے میں دو غلطیاں..... ۳۶

۳۵..... قلب سے دشمن کو نکالنے کی تدبیر..... ۳۷

۳۶..... ذکر کے علاوہ اعمال حسنہ کی ضرورت..... ۳۸

۳۷..... عقل اور نقل میں مناسبت..... ۳۹

۳۸..... صرف ذکر لسانی کافی نہیں..... ۴۱

۳۹..... دل اعمال صالحہ سے آباد ہوگا..... ۴۱

۴۰..... وسوسہ کس صورت میں مضر ہوجاتا ہے؟..... ۴۱

۴۱..... وسوسہ کا علاج..... ۴۲

۴۲..... وسوسہ غفلت کا ابتدائی اثر ہے..... ۴۲

۴۳..... وسوسہ گناہ کا مقدمہ ہے..... ۴۳

۴۴......	اسرار شریعت......................	۴۴
۴۵......	مشتبہات میں پڑنا بھی خطرناک ہے......................	۴۵
۴۶......	وسوسہ گناہ نہیں......................	۴۵
۴۷......	غیر اختیاری وسوسوں سے ڈرنا نہ چاہیے......................	۴۶
۴۸......	وسوسہ کی مثال......................	۴۷
۴۹......	رسوخ ذکر کی تدبیر......................	۴۸
۵۰......	مشقت اور مجاہدہ سے ثواب بڑھ جاتا ہے......................	۴۹
۵۱......	حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عجیب شان......................	۵۰
۵۲......	فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بلیغ مثال......................	۵۱
۵۳......	ذکر کے ساتھ وسوسہ مضر نہ ہونے کی مثال......................	۵۱
۵۴......	وسوسہ بعض دفعہ نافع ہوجاتا ہے......................	۵۲
۵۵......	وسوسہ بلا ذکر مذموم ہے......................	۵۳
۵۶......	عبادت میں دھیان کی ضرورت......................	۵۳
۵۷......	ذکر کی حقیقت......................	۵۵
۵۸......	آج کل کی عبادت اور ذکر محض ایک رسم ہے......................	۵۶
۵۹......	ذکر اللہ کا اثر......................	۵۶
۶۰......	بعض احکام کی علت معلوم نہیں......................	۵۷
۶۱......	ذکر لسانی مع توجہ قلب کے افضل......................	۵۸
۶۲......	استغراق کی حقیقت......................	۵۹
۶۳......	ذکر لسانی کی عجیب مثال......................	۵۹
۶۴......	نماز کی نیت زبان سے کرنا مستحب ہے......................	۶۰
۶۵......	ذکر بالجہر کی مصلحت اور حکمت......................	۶۰
۶۶......	شیخ کامل کی ایک حالت......................	۶۱
۶۷......	بعض علماء و مشائخ کا باہمی حسد......................	۶۲

۶۸..... تصوف کوئی قرنطینہ نہیں ہے..... ۶۳

۶۹..... ذکر جہر میں اعتدال..... ۶۳

۷۰..... تصوف کو ہوّا سمجھنا غلطی ہے..... ۶۴

۷۱..... تصوف سے ڈرنے والے اس کے اصل چہرہ سے روشناس نہیں... ۶۵

۷۲..... ذکر کا اثر محسوس نہ ہونے کا سبب..... ۶۸

۷۳..... دل کی عجیب وغریب مثال..... ۶۸

۷۴..... محاورات میں غیر اور عین کے معنی..... ۷۰

۷۵..... اہل اللہ جہلاء سے نہیں الجھتے..... ۷۱

۷۶..... توجہ الی المحبوب کے تین درجات..... ۷۲

۷۷..... عارف کا عالم سے تعلق کس قسم کا ہوتا ہے..... ۷۳

۷۸..... عالم میں مراۃ حق بننے کی استعداد ہے..... ۷۴

۷۹..... حسینان جہان میں مراۃ ہونے کی استعداد نہیں..... ۷۴

۸۰..... ذکر اللہ کے مختلف طرق..... ۷۶

۸۱..... مختلف اوقات میں مختلف دعاؤں کی حکمت..... ۷۷

۸۲..... آئینہ میں محبوب کو دیکھو..... ۷۷

۸۳..... شریعت میں کسب دنیا کی اجازت ہے انہماک کی نہیں..... ۷۸

۸۴..... قلب کو فارغ رکھنے کی ضرورت..... ۷۸

۸۵..... خلاصہ وعظ..... ۷۹

۸۶..... واقعہ۔۱..... ۷۹

۸۷..... واقعہ۔۲..... ۷۹

۸۸..... اخبار الجامعہ..... ۸۱

وعظ

القاف

(ذکر کی اہمیت وافادیت)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ وعظ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ بروز یکشنبہ بمقام قنوج متصل مکان شیخ معشوق علی صاحب ہیں حضرت والا نے کھڑے ہوکر ۲ گھنٹے ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی اور مستورات بھی تھیں۔ حکیم محمد مصطفی صاحب بجنوری رحمہ اللہ نے قلم بند فرمایا۔

اس وعظ میں حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی خواص عقل سے معلوم ہوسکتے ہیں دوسرے وہ جن کے خواص کے ادراک کے لیے عقل کافی نہیں بلکہ وحی کی ضرورت ہے احکام شرعیہ کی حکمت اگر عقل سے معلوم نہ ہو تو کچھ بعید نہیں کیونکہ وہ خلاف عقل نہیں بلکہ ماوراء العقل ہیں۔ حضرت نے تفصیل سے بیان کرنے کے بعد وساوس کا علاج بھی ذکر فرمایا ہے۔ انتہائی مفید وعظ ہے ہر خاص وعام کو اس سے استفادہ کرنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائیں۔

خلیل احمد تھانوی

۲۰۱۹/۲/۲ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارك وسلم أما بعد:

وجہ تسمیہ

ذکر کو مشابہت جبل قاف(۱) سے ہے ارتفاع میں بھی اور استحکام میں بھی اور جائے پناہ ہونے میں بھی اور اس کے مقابل یعنی غفلت کے کھڈ(۲) اور غار کے مشابہ ہونے میں بھی اور لطیفہ یہ ہے کہ قنوج(۳) کے شروع میں بھی جو کہ محل وعظ ہے قاف ہے اور اس سے پہلے ایک وعظ کالپی(۴) میں ہو چکا ہے جس کا نام الکاف ہے۔ (بتشدید الفاء بمعنی المانع) اس میں معاصی سے جو کہ مانع عن الذکر(۵) ہیں تحرز کا بیان تھا اور اتفاق سے وہ لطیفہ ابتداء کے حروف کے توافق کا(۶) اس میں بھی تھا اور (فرمایا کہ) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جبل قاف محیط ہے ارض کو(۷) اگر یہ ثابت ہو تو مشابہت ہوئی احاطہ میں بھی، کہ ذکر میں بھی احاطہ کی شان ہے(۸)۔ جیسا عنقریب تشبیہ عروق سے مفہوم ہوتا ہے(۹)۔ نیز لکھا ہے کہ جبل قاف کے عروق ہیں جو زمین میں پھیلے ہوئے ہیں جن کے ذریعے سے اثر تمام زمین میں پہنچتا ہے اسی طرح ذکر کا اثر قلب سے تمام بدن میں پہنچتا ہے۔ نیز قنوج کی زمین کی حالت بھی دو طرح کی ہے بعض جگہ کھڈ ہیں اور بعض جگہ اونچے پہاڑ کی طرح

(۱) کوہ قاف سے بلند اور استحکام میں مشابہت ہے (۲) خندق (۳) علاقہ کا نام ہے جس جگہ یہ وعظ ارشاد فرمایا (۴) قصبہ کا نام ہے (۵) گناہ جو ذکر سے روکنے والے ہیں ان کا تذکرہ تھا (۶) وہاں بھی جگہ اور وعظ کے نام ایک ہی لفظ سے یعنی کاف سے شروع ہوتے تھے جیسے اس وعظ میں وعظ اور جگہ کا نام قنّ سے ہے (۷) کوہ قاف نے پوری زمین کو گھیرا ہوا ہے (۸) ذکر کے اثر سے سارا بدن متاثر ہوتا ہے (۹) رگوں کی تشبیہ سے سمجھ میں آئے گا۔

تو ذکر مشابہ جبل ہے ارتفاع(۱) میں اور اس کا مقابل یعنی غفلت مشابہ کھڈ کے ہے۔

دعا خطبہ

اما بعد! فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم ان الشیطان جاثم علی قلب ابن آدم فاذا ذکر اللّٰہ خنس واذا غفل وسوس (۲)

کسی چیز کی خاصیت جاننے کا نفع

یہ ایک حدیث ہے جو میں نے اس وقت پڑھی۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کی دو خاصیتیں بیان فرمائیں ہیں۔ ان دو چیزوں کو سب جانتے ہیں لیکن ان کی خاصیتوں سے آگاہی (۳) کم ہے اور اس آگاہی نہ ہونے سے دو قسم کی مضرتیں ہوتی ہیں (۴) ایک یہ کہ جب کسی چیز کی خاصیت کا علم نہیں ہوتا تو اگر اس میں کچھ نفع ہے تو اس کے حاصل کرنے کی طرف رغبت (۵) نہیں ہوسکتی اور اگر اسمیں نقصان ہے تو اس سے بچنے کی کوشش نہیں ہوسکتی۔ سنکھیا(۶) سے جو لوگ ڈرتے اور احتیاط کرتے ہیں اس کی وجہ علم خاصیت ہی ہے کہ جانتے ہیں کہ اس کا کھانا قاتل ہے، ورنہ ممکن تھا کہ اس کی صورت اور رنگ اور آب و تاب کو دیکھ کر کسی نادان کو رغبت ہوجاتی۔ چنانچہ بہت سی وہ چیزیں جن کی خاصیت معلوم نہیں ہے کھالی جاتی ہیں اور نقصان پہنچتا ہے۔ بہت دفعہ کسی نافع چیز کے دھوکے میں زہر کھالیا گیا ہے۔ مثلاً طباشیر سمجھ کر سنکھیا(۷) کھالیا گیا اور موت تک نوبت آ گئی۔ اس کی وجہ کیا ہے وہی جہل عن الخاصیت (۸) اسی طرح اعمال کی حالت ہے جس کام کا اثر معلوم نہ ہو عجب نہیں اس پر عمل کرلیا جائے جس کو یہ معلوم نہ ہو کہ گلے میں پھانسی ڈالنے سے مرجاتے ہیں عجب نہیں کہ وہ کبھی ایسا کر بیٹھے چنانچہ بعض جگہ لڑکوں سے ایسا بھی ہوا کہ ہنسی ہنسی گلے میں رسی ڈالی اور کھینچ لی اور ہنسی کی گل پھنسی

(۱) ذکر بلندی میں پہاڑ کے مشابہ اور غفلت پستی میں کھڈوں کے مشابہ ہے (۲) ”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! شیطان انسان کے دل سے چپکا رہتا ہے جب وہ دل سے اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ ذکر اللہ سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے“ تفسیر القرطبی: ۲۰/ ۲۶۲ (۳) واقفیت (۴) دو نقصان ہوتے ہیں (۵) دلچسپی (۶) زہر (۷) مفید معدہ دوا سمجھ کر زہر کھالیا (۸) خاصیت سے واقف نہ ہونا۔

ہوگئی اور قتل نفس ہوگیا۔ پس ثابت ہوا کہ مضر (۱) چیز سے بچانے کی تدبیر یہی ہے کہ اس کی خاصیت بتلادی جائے اسی طرح نافع (۲) چیز کی حالت ہے کہ اس کی طرف رغبت جبھی ہوسکتی ہے جبکہ اس کی خاصیت اور منفعت معلوم ہو اور اگر کسی چیز کا فائدہ معلوم نہ ہوتو بسا اوقات ایسی ایسی مفید چیزیں پاس پڑی رہتی ہیں جو بہت قیمتی اور کام کی ہوتی ہیں مگر ان سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا، ناواقف کے ہاتھ بہت دفعہ ہیرے اور جواہرات آگئے ہیں اور ان کو کوڑیوں میں دے دیا، اسکو یہ نقصان ہوا اور مشتری کو علم خاصیت کی وجہ سے یہ فائدہ پہنچا کہ لاکھوں روپیہ کی چیز کوڑیوں میں مل گئی۔ یہی حالت ہے۔

اعمال کے خواص جاننے کے فائدے

اعمال کی خاصیت کا جس کو علم ہوجائے کہ فلاں عمل سے یہ ترقی ہوسکتی ہے وہ ذرا دیر میں ایسی ترقی کرجاتا ہے کہ دوسرا آدمی سالہا سال میں بھی نہیں کرسکتا۔ علم خاصیت ہی ایک ایسی چیز ہے کہ آدمی کا نافع (۳) کی تحصیل میں جو ناگواریاں بھی پیش آئیں ان کو آسان کردیتی ہے۔ دیکھئے بدمزہ دوا کی خاصیت اجمالاً مریض کو یا تفصیلاً طبیب کو معلوم نہ ہوتو مسہل (۴) کون دے جس کی بدمزگی دور کرنے کے لیے پان اور الائچی کی ضرورت ہوتی ہے بازو باندھے جاتے ہیں یہ سب کچھ اسی لیے کیا جاتا ہے کہ یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ایسی بدمزہ چیز قے ہوکر پیٹ میں سے نکل جائے پس اس کو آسان کرنے والی چیز اگر ہے تو وہی علم خاصیت ہے کہ اس دوا سے امید ہے کہ تندرست ہوجائیں گے۔ غرض کہ علم خاصیت ہی جالب نفع ہے (۵) اور علم خاصیت ہی منفعت ہے خاصیت نہ جاننے کا پہلا ضرر یہ ہے (۶) کہ بدون علم خاصیت کے استعمال نافع اور احتراز عن الضرر (۷) دونوں سے محرومی رہتی ہے اور دوسری مضرت (۸) یہ ہے کہ اگر بالفرض نافع کے استعمال سے محرومی بھی نہ ہوئی بلکہ اتفاقاً یا کسی کی تقلید سے اس کا استعمال بھی کرلیا تب بھی بدون علم خاصیت کے گو اجمالاً ہی معتد بہ نفع مرتب (۹) نہیں

(۱) نقصان دہ (۲) مفید چیز (۳) دست آور دواء (۴) خاصیت کا علم ہونا ہی نفع کے حصول کا باعث ہے (۵) نقصان (۶) مفید کے استعمال اور نقصان دہ سے بچنا دونوں سے محروم رہتا ہے (۷) دوسرا نقصان (۸) قابل اعتبار نفع نہیں ہوتا۔

ہوتا گوظاہر میں اس صورت میں خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس کو علم خاصیت کی ضرورت نہیں کیونکہ جو غرض تھی علم خاصیت سے یعنی استعمال نافع وہ اس کو حاصل ہے۔

علم خاصیت ہر شخص کو مفید ہے

لیکن میں اس صورت میں بھی یہی کہتا ہوں کہ علم خاصیت کی اس شخص کو بھی ضرورت ہے اور بلا اس کے اس کو پورا فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور یہ بات گو اول وہلہ (۱) میں بالکل اجنبی سی معلوم ہوگی خصوصاً طالب علموں کو کیونکہ ان کو ہر بات میں لم اور کیف (۲) کی ضرورت ہے مگر میں اس کو ایسا قریب الی الفہم کردوں گا (۳) کہ ان شاء اللہ تعالیٰ کچھ شک وشبہ باقی نہ رہے گا۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ اطباء دوا سے امراض کا علاج کرتے ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ دواؤں میں خواص ہیں لیکن تحقیق اطباء کی یہ ہے کہ گو دوا سے مرض کو آرام ہوتا ہے مگر فاعل دوا نہیں ہے بلکہ طبیعت فاعل ہے اسی واسطے معالجہ میں تقویت طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی واسطے قوی الطبع شخص (۴) کو دوا کا اثر جلد ہوتا ہے اور ضعیف (۵) الطبع کو اثر دیر میں ہوتا ہے جواں آدمی کو جلد فائدہ پہنچتا ہے اور بڈھے کو دیر میں ایک مقدمہ تو اس کو سمجھئے یعنی گو دوا سے فائدہ پہنچتا ہے مگر فاعل طبیعت ہے اور اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملایئے کہ جیسے مقوی دوا کے استعمال سے قوت آتی ہے۔

خیال مؤثر چیز ہے

اسی طرح خیال بھی ایک مؤثر چیز ہے اور اس کو انسان کے افعال میں بڑا دخل ہے یہ ایسی بات ہے جس کو عوام تک تسلیم کرتے ہیں۔ گویا بدیہی ہے اور اس کے لیے دلیل کی حاجت نہیں، دیکھئے سب جانتے ہیں کہ اگر مریض کو اعتقاد ہو طبیب سے، تو چاہے وہ طبیب اپنے فن کا کامل بھی نہ ہو تو نفع بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یا کسی کو کسی دوا پر اعتقاد ہو تو وہ دوا اس کی طبیعت سے خوب ساز کرتی ہے (۶) اور فائدہ جلد ہوتا ہے یہاں تک کہ ایسا بھی ہوا اور ہوتا ہے کہ ایک دوا کا اثر فی الواقع اور ہے اور کتابوں میں بھی

(۱) ابتدائی مرحلہ میں (۲) کیوں اور کیسے (۳) باسانی سمجھا دوں گا (۴) مضبوط طبیعت کے حامل شخص کو (۵) کمزور طبیعت (۶) طبیعت کے موافق ہوتی ہے۔

وہی لکھا ہے مگر لوگ اس کو ضد میں استعمال کرتے ہیں ان کے خیال میں چونکہ اثر بھی یہی ہے لہٰذا وہی اثر وجود میں آجاتا ہے جو ان کے اعتقاد میں ہے بہت سے گرم دوائیں تسکین عطش (۱) کے لیے عوام استعمال کرتے ہیں جو طبی تحقیق کے خلاف ہے لیکن نفع اور اثر ہوتا ہے، وجہ اس کی صرف خیال ہے علیٰ ہذا اس کی ضد یعنی بداعتقادی سے عدم نفع یا ضعف نفع ہوجاتا ہے (۲) اور یہ دن رات کا مشاہدہ ہے تو خاصیت کے معلوم ہونے سے یہ فائدہ ہے کہ اس دوا پر اعتماد اور اعتقاد ہوگا اور اس سے تعجیل نفع کی امید ہے۔

مالیخولیا میں علاج سے کم نفع ہونے کا سبب

چنانچہ مالیخولیا (۳) میں جو نفع کم ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ مریض کو اعتقاد نہیں ہوتا کیونکہ اعتقاد صحت خیال سے ہوتا ہے اور مالیخولیا فساد خیال ہی کا نام ہے اور اس کے جملہ خیالات فاسد ہیں بلکہ مجنون کو تو الٹی ہی سوجھتی ہے اسی لیے مجنون کے علاج میں بڑے ہوشیار اور عاقل طبیب کی ضرورت ہے تاکہ وہ تدبیر سے خیال کو بدلے۔ ایک قصہ ہے کہ ایک شخص کو وہم ہوگیا کہ میرا جسم شیشہ کا ہوگیا ہے۔ اسی وجہ سے سب سے الگ رہتا تھا اور ذرا کوئی پاس کو نکلتا تو بچتا کہ میں ٹوٹ جاؤں گا، اطباء اس کے علاج سے عاجز تھے، مشہور ہے کہ وہم کی دارو (۴) لقمان کے پاس بھی نہیں۔ ایسے ہی علاجوں میں قابلیت دیکھی جاتی ہے۔

یک من علم را دہ من عقل باید (۵)

ایک طبیب ایسے بھی مل گئے جن کے خیال میں تدبیر آگئی۔ انہوں نے نبض دیکھنا چاہا تو مریض نے کہا کہ ہاتھ نہ لگائے، میرا بدن شیشہ کا ہے ٹوٹ جاؤں گا۔ انہوں نے کسی موقع پر اس کے اوپر لحاف ڈالوا کر سب بدن ڈھانک دیا اور منہ بھی ڈھانک دیا اور کچھ ناکارہ بوتلیں پہلے سے مہیا کر رکھی تھی ان بوتلوں کو لحاف کے اوپر رکھ کر تڑوا دیا، لحاف اوڑھانے میں یہ بھی مصلحت تھی کہ بدن کو آزار نہ پہنچے (۶)۔ (شریف طبیب

(۱) پیاس بجھانے کے لیے (۲) فائدہ نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے (۳) پاگل پن (۴) علاج وہم (۵) ''ایک من علم کے لیے دس من عقل کی ضرورت ہے'' (۶) تکلیف۔

بھی کیا چیز ہے جسمانی ہو یا روحانی وہ یہ نہیں چاہتا کہ مریض کو تکلیف پہنچے) وہ بوتلیں ٹوٹنے کے وقت یہ سمجھا کہ میرا بدن ٹوٹ رہا ہے، بہت شور مچایا پھر طبیب نے لحاف اتروا کر مریض سے کہا دیکھو یہ مرض تھا واقعی تمہارے جسم پر ایک خول شیشہ کا پیدا ہو گیا تھا اس کو میں نے تڑوا دیا، یہ کانچ اسی کا ہے اب جسم تمہارے اندر سے صحیح سالم نکل آیا اب تم دیکھ لو اور امتحان کر لو کہ اب چھونے سے نہ ٹوٹے گا۔ اس معالج نے خیال میں تصرف کیا اور اس کو صحیح کر دیا۔ یہی مانع تھا نفع (۱) سے، اب معالج جو کچھ کرے گا مفید ہوگا یہ بڑے مدبر اور حاذق کا کام ہے تو خیال کا دخل نفع میں اس درجہ ہے اب سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

علم خاصیت میں دو حکمتیں

علم خاصیت میں دو حکمتیں ہوئیں ایک یہ کہ وہ جالب نفع اور سالب ضرر ہے (۲) دوسرے یہ کہ اگر نفع بلا اس کے حاصل بھی ہو جائے تب یہ اس کے لیے مکمل اور مقوی اثر ہے اور بلا اس کے نفع ناقص ہوتا ہے۔ اب تیسری بات یہ اور سمجھئے کہ جیسے دوا میں اثر ہے اسی طرح اعمال میں بھی اثر ہے اور اس کا دعویٰ فقط شریعت ہی نے نہیں کیا بلکہ اپنی عادات میں بھی دیکھ لیجئے کہ عمل پر اثر مرتب ہوتا ہے مثلاً کوئی کسی کو گالی دیتا ہے تو فوراً کیسا غصہ آ جاتا ہے۔ یہ کا ہے کا اثر ہے کوئی دوا اس کو نہیں کھلائی گئی کوئی ضرب اس کو نہیں لگائی گئی فقط ایک عمل کا اثر ہے یا کوئی جھک کر سلام کرے تو اس سے خواہ مخواہ محبت پیدا ہوتی ہے حالانکہ اس نے کچھ گھی نہیں پلا دیا، یہ فقط ایک عمل کا اثر ہے کسی سے میٹھی بات سن کر آدمی اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

آدمی فربہ شود از راہ گوش جانور فربہ شود از ناؤ و نوش (۳)

کیفیات و آثار پیدا ہونے کا سبب

بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ اکثر کیفیات و آثار پیدا ہونے میں اعمال ہی مؤثر ہوتے ہیں۔ ان کا وہی اثر ہوتا ہے جو جانور میں خورد و نوش (۴) کا

(۱) اسی رکاوٹ کی وجہ سے فائدہ نہیں ہو رہا تھا (۲) فائدہ پہنچانے والی نقصان سے بچانے والی (۳) ''آدمی کان کے راستے سے موٹا ہوتا ہے (یعنی تعریف سے پھولے نہیں سماتا) اور جانور کھانے پینے سے موٹا ہوتا ہے'' (۴) کھانے پینے کا۔

اثر ہوتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اکثر کیفیات دو کیفیتوں کی طرف راجع ہوتی ہیں جن کا نام رضا وسخط ہے(۱) اور رضا وسخط کا منشا اعمال ہی ہیں، انسان راضی ہوتا ہے تو کسی کام سے ہی ہوتا ہے اور ناراض ہوتا ہے تو کسی کام ہی سے ہوتا ہے۔ اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ کیفیات کے پیدا ہونے میں مؤثر اعمال ہی ہیں اور یہ ایسی چیز ہے کہ سخت سے سخت اور قوی سے قوی شخص بھی اس سے نہیں بچ سکتا، کیسا ہی کوئی متین اور مستقل آدمی ہو مگر اس پر بھی ان چیزوں کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

مزاج میں لطافت کی زیاتی کا اثر

انسانوں میں سب سے بڑا آدمی بادشاہ ہوتا ہے جس کا استقلال(۲) اس درجہ ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی مہم سے بھی طبیعت میں تغیر نہیں آتا مگر بات کا اثر اس پر بھی ہوتا ہے بلکہ اوروں سے زیادہ ہوتا ہے اس زیادتی کی وجہ ضعف طبیعت نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ جوں جوں آدمی بڑا ہوتا جاتا ہے مزاج میں زیادتی لطافت آتی جاتی ہے اور لطافت زیادہ ہونے سے حس بڑھ جاتی ہے تو ادنیٰ شے سے بھی انفعال ہوتا ہے(۳)۔ بادشاہوں کی نسبت کہا گیا ہے:

گاہے بسلامے بر بخندد گاہے بدشنامے خلعت دہند(۴)

(جب بڑے سے بڑے پر بھی بات کا یہ اثر ہوتا ہے تو اوروں کا حال ظاہر ہے) تو ثابت ہوا کہ ہر انسان پر عمل مؤثر ہوتا ہے۔ غرض دونوں مقدمے ثابت ہوگئے کہ اثر کے لیے علم خاصیت کی ضرورت ہے اور یہ کہ اعمال بھی دوا کی طرح مؤثر ہیں اب یہ نتیجہ لینا بہت ہی سہل ہے کہ نفع عمل کے لیے خواص کا علم ضروری ہے۔

اعمال کی دو اقسام

اب سمجھئے کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے خواص عقل سے معلوم ہوسکتے ہیں۔ عقل سے مراد ادراک حواس و عقل(۵) سب ہے، کوئی عقل بالمعنی الفلسفی نہ لے اور دوسری قسم وہ جن کی خاصیت عقل سے معلوم نہیں ہوسکتی اور ان کی خاصیت

(۱) خوشی وناخوشی (۲) اتنا مستقل مزاج ہوتا ہے (۳) معمولی بات سے بھی متاثر ہوتا ہے (۴) کبھی سلام کرنے پر رنجیدہ ہوجاتے ہیں اور کبھی گالی دینے پر بھی خوش ہوتے ہیں (۵) حواس خمسہ اور عقل سب سوار ہیں۔ یہی پانچ چھ ذرائع علم ہیں۔

کے معلوم ہونے کے لیے ایک چیز کی ضرورت ہے جو وراء العقل یعنی عقل سے بالاتر ہے اس کا نام وحی ہے۔ اعمال شرعی اسی دوسری قسم کے اعمال ہیں جن کے منافع ومضار صرف(۱) وحی سے اور ارشاد انبیاء علیہم السلام سے معلوم ہوسکتے ہیں۔ عقل ان کے ادراک کے لیے کافی نہیں۔ میری اس تقریر سے یہ خلجان رفع ہوجائے گا(۲) کہ بہت سے مذہبی کام محض اعتقاد سے مفید تسلیم کرلیے گئے ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ کہ مسلمان ہر روز پانچ مرتبہ دنیاوی کاموں کا حرج کرتا ہے اور ایک مہینہ تک بھوکا رہتا ہے ان میں اور ان کے نتیجہ متوقعہ میں علاقہ کیا ہے(۳) جس کی امید پر ان کو کیا جاتا ہے۔

بہت سی باتیں وراء العقل ہیں

رفع خلجان (شک دور کرنا) کی تقریر یہ ہے کہ وہ علاقہ مدرک بالعقل (عقل کی سمجھ میں نہ آنے والی) نہیں اس کا ادراک ایک دوسرے ذریعہ سے ہوا ہے جو وراء العقل ہے(۴) اور عقل اس کو صحیح مانتی ہے کیونکہ صحت وحی اور صدق رسالت پر دلائل عقلی قائم ہیں غرض بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کے ادراک کے لیے عقل کافی نہیں مثلاً زمانہ ماضی میں کسی چیز کا وقوع محض اخبار سے مانا جاتا ہے عقل وحواس اس کے ادراک کے لیے ناکافی ہیں بس ان کا کام اس میں صرف اتنا ہے کہ اس کے امکان کو ادراک(۵) کرلیں کہ ایسی چیز کے سچ ماننے میں کوئی امتناع عقلی تو لازم نہیں آتا اور خبر دینے والا سچا ہے جب ان دونوں باتوں کا ادراک عقل سے ہوجائے تو کسی خبر کا یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ورنہ دنیا کا ایک کام بھی نہ ہو تو دیکھئے باوجود اس خبر کے مدرک بالعقل نہ ہونے کے اس کو ماننا پڑا تو ثابت ہوا کہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے ادراک کے لیے عقل کافی نہیں پھر اسی قبیل سے (۶) اعمال شرعی بھی ہوں تو کیا تعجب کی بات ہے، یہ تقریر ہوئی رفع خلجان (۷) کی۔

عالم شریعت سے کسی کو حق مزاحمت (۸) نہیں ہے

اور ایک فائدہ میری تقریر سے یہ نکلا کہ جیسے اطباء سے

(۱) جنکا مفید ومضر ہونا صرف وحی سے یا ارشاد نبوی سے معلوم ہوگا (۲) پریشانی دور ہوجائیگی (۳) تعلق کیا ہے (۴) عقل سے بالاتر (۵) کہ ان کا ہونا عقلاً ممکن ہے (۶) قسم سے (۷) شک دور کرنے (۸) الجھنے کا حق نہیں۔

مزاحمت امر طبی (۱) میں نہیں کی جاتی، اس اعتماد پر ہے کہ واقف ہیں خواص اشیاء اور طرق تشخیص سے، ایسے ہی عالم شریعت سے کسی کو حق نہیں ہے مزاحمت کرنے کا فتویٰ میں۔ چنانچہ آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ علاج کے لیے ایک طبیب کو منتخب کر لینے کے بعد اس سے نسخہ میں یا پرہیز میں کسی تدبیر میں کوئی مزاحمت کرتا ہو اور منتخب کر لینے کے بعد کا لفظ اس واسطے کہا گیا کہ اس انتخاب سے پہلے اجازت ہے، تحقیق اور ہر قسم کی نکتہ چینی کی، بلکہ ضرورت ہے کہ خوب چھان بین کے بعد کسی کو معالج اور معتمد بنایا جائے اور جب یہ تحقیق کر لی گئی اور کسی کو معتمد بنالیا گیا تو پھر اجازت نہیں ہے اس کے سامنے مزاحمت کرنے کی بلکہ کسی قسم کے چوں وچرا کی بھی۔ غرض طبیب سے کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔ اس مزاحمت نہ کرنے کی وجہ دو ہیں ایک یہ کہ وہ قابل اعتماد ہے اور علاج میں غلطی نہ کرے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر اس سے بگاڑی جائے گی تو وہ بددل ہوجائے گا اور علاج چھوڑ دے گا اور ہمارا مقصود، یعنی صحت حاصل نہ ہوگی، ان ہی دونوں وجہ سے معالج روحانی سے مزاحمت نہ کرنی چاہیے۔

طبیب باطنی کسی مرض کو لا علاج نہیں کہتا

اس پر اعتماد بھی پورا ہونا چاہیے اور اس کو مکدر (۲) بھی نہ کرنا چاہیے جب طبیب ظاہری پر اعتماد ہے، حالانکہ وہ ایسے اصول کو جانتا ہے جن کو وہ خود ظنی کہتا ہے تو طبیب باطنی پر کیوں اعتماد نہ ہو جس کا علم وحی قطعی کی طرف سے مستند ہے (۳)۔ دوسرے طبیب روحانی طبیب ظاہری سے زیادہ کامل بھی ہے کیونکہ طبیب ظاہری بہت سے امراض میں جواب بھی دے دیتا ہے اور طبیب باطنی کسی مرض کو لا علاج نہیں کہتا، برے سے برے اور سخت سے سخت مرض کا علاج کرسکتا ہے۔ علاج کر کے دیکھو۔ پس اس سے بھی مزاحمت کا حق کسی کو نہیں۔ آج کل عجیب مذاق ہوگیا ہے کہ ذرا کسی نے پڑھ لکھ لیا اور اعمال شرعی میں دخل دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عقل کی بات ہے حتیٰ

(۱) حکیم سے طبی احکام میں نہیں الجھا جاتا کہ وہ چیزوں کے خواص اور طریقہ علاج سے واقف ہیں (۲) اس کو ناراض بھی نہ کرے (۳) جس کا علم وحی الٰہی جو قطعی ہے اس سے ماخوذ ہے۔

کہ زبان پر بھی یہ لفظ آتا ہے کہ ایسے بیوقوف نہیں ہیں کہ بلا سوچے سمجھے مان لیں اور اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ بلا علت معلوم کیے کسی بات کو تسلیم کرلیں اب تعلیم کا زمانہ ہے حیرت ہے کہ یہی بات ڈاکٹر اور طبیب سے کیوں نہیں کی جاتی؟

دوسرے کے کام میں دخل دینا نقصان عقل کی بات نہیں ہے؟

میں کہتا ہوں کہ یہ نقصان عقل کی دلیل ہے کہ اس کام میں دخل دیا جائے جس کو آدمی جانتا نہ ہو کتنا ہی کوئی عاقل ہو اس کو ایک ادنیٰ درجہ کے کام میں بھی جس کو جانتا نہ ہو دخل نہ دینا چاہیے۔ ایک بی اے پاس کو جولاہا کے کام میں بھی دخل دینے کا حق نہیں اور اگر ایسا کرے گا تو وہ جولاہا اس کی غلطی پکڑ لے گا۔ اس وقت ثابت ہوجائے گا کہ تعلیم سے جولاہا(۱) کے برابر بھی عقل پیدا نہیں ہوتی اور آج کل تو یہ مسئلہ تمام جہان کے نزدیک مسلم ہوگیا ہے کہ تقسیم عمل سے چارہ نہیں اور ترقی کا مدار یہی ہے۔ چنانچہ جس فن کا جو آدمی ہوتا ہے اس کا فیصلہ اس فن کے متعلق نافذ مانا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر ایک شخص کو کہہ دیتا ہے کہ اس کے قویٰ قابل ملازمت نہیں تو اس کو ملازمت نہیں مل سکتی خواہ ڈاکٹر نے یہ حکم کسی غرض فاسد سے غلط ہی لگا دیا ہو یا ایک انجینئر ایک لاکھ روپیہ کی عمارت کو کہہ دے کہ یہ گرا دینے کے قابل ہے تو گرا دی جاتی ہے۔ خواہ اس نے بددیانتی ہی سے کہا ہو مگر چونکہ اس کو ایک فن میں ماہر تسلیم کرلیا گیا ہے اس لیے اس کے احکام میں مزاحمت نہیں کی جاتی۔ غور کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنا کمال عقل حاصل ہوگا عقل اتنا ہی مزاحمت سے روکے گی نہ یہ کہ عقل جوں جوں بڑھتی جائے اتنی ہی دوسرے کے کام میں دخل دینے کی اجازت ہوتی جائے جیسے آج کل کے تعلیم یافتوں کا مذاق ہوگیا ہے۔ گفتگو یہ تھی کہ اعمال میں بھی ادویہ کی مانند خواص ہیں اور بعض اعمال کے خواص کا علم صرف وحی سے ہوسکتا ہے اور ان کا بتلانے والا بھی حق تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور وہی اس فن کا آدمی ہے اس کو نبی کہتے ہیں تو اس سے مزاحمت کا کسی کو حق نہیں۔ تو اب غلطی ان لوگوں کی واضح ہوگئی جو تھوڑا سرمایہ عقل لے کر نبی سے مزاحمت کی ہمت کرنے لگتے ہیں۔

(۱) کپڑا بننے والے کے برابر فٹنس سرٹیفکیٹ نہ دے۔

جیسا آج کل مذاق ہوگیا ہے اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ آج کل کوئی نبی موجود ہے، نبوت ختم ہوچکی ہے لا نبی بعدی تصریحًا حدیث میں آچکا ہے جو کوئی مدعی نبوت موجود ہو یا پیدا ہو اس کو جھوٹا سمجھو۔

علوم نبوت محفوظ ہیں

ہاں ان کے غلام موجود ہیں اور علم نبوت محفوظ ہیں وہ ان علوم کو ظاہر کرتے ہیں اور جو وحی نے بتایا تھا وہ وہی بتاتے ہیں ان کی مزاحمت نبی ہی کی مزاحمت ہے جیسے ایک چپڑاسی کی مزاحمت حاکم ہی کی مزاحمت ہے۔ سمن لے کر اگر چپڑاسی آئے اور کوئی اس کو بجائے تعمیل کرنے کے پھاڑ کر پھینک دے تو اس پر وہی دفعہ لگائی جائے گی جو منہ در منہ حاکم کے مزاحمت پر لگائی جاتی اور یہ عذر اس کا قابل سماعت نہ ہوگا کہ میں نے تو ایک چپڑاسی کی مزاحمت کی تھی نہ کہ حاکم کی، وجہ کیا ہے کہ چپڑاسی صرف واسطہ ہے حکم پہنچانے کا اور حکم حاکم ہی کا ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے غلام اور ورثاء یعنی علماء صرف حکم سنا دینے والے ہیں نہ کہ اس کو ایجاد کرنے والے اور ان کے احکام نبی ہی کے احکام ہیں اور نبی کے احکام درحقیقت خدا کے احکام ہیں۔ ان کی مزاحمت پر وہی جرم ہوگا جو نبی اور خدا کی مزاحمت پر ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرورت ہے کہ پہلے اس حکم سنانے والے کا عالم محقق ہونا اور متقی و دیانتدار ہونا معلوم کرلیا جائے، ورنہ وہ عالم نہ ہوگا بہروپیہ ہوگا اور چپڑاسی کے بھیس میں کوئی بہروپیہ آجائے تو اس کی مزاحمت جرم نہیں لیکن جس کا عالم محقق متقی ہونا تحقیق سے آپ کو معلوم ہوچکا ہے اس کی مزاحمت کا آپ کو کوئی حق نہیں اور مزاحمت کی صورت میں مجرم قرار پاؤ گے اور ایسے شخص کی مزاحمت نقل کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عقل کا خود تقاضا یہ ہے کہ جو شخص جس فن کو جانتا ہے، نہ جاننے والوں کو اِس کی مزاحمت نہ کرنا چاہیے مگر افسوس ہے کہ اس وقت ایک زمانہ کا مذاق یہی ہوگیا ہے کہ دین کی جب کوئی بات سنیں گے تو اول سوال یہی ہوگا کہ اس کی کیا وجہ، طبیب نسخہ میں ایک دو تین ماشہ لکھے اور ایک چار ماشہ تو اس سے نہیں پوچھتے کہ دونوں کے وزن میں فرق کرنے کی کیا وجہ اور احکام شرعی میں پوچھتے ہیں کہ عصر کی چار

رکعت اور مغرب کی تین رکعت ہونے کی کیا وجہ۔ طبیب سے اگر پوچھیں کہ تین ماشہ اور چار ماشہ ہونے کی کیا وجہ تو وہ جواب دے گا کہ تم کو کیا مجاز ہے(۱) اور تم اس کی تحقیق کرنے والے کون ہو حالانکہ وہ تشخیص اور علاج میں فاعل مختار نہیں ہے بلکہ ایک قانون کا جس کا نام طب ہے پابند ہے اس سے ایک درجہ میں یہ سوال نازیبا بھی نہیں کیونکہ سوال کے یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ جس طب کے پابند ہونے کے تم مدعی ہو اس تجویز کا اس سے ثبوت دو۔

حق تعالیٰ شانہ سے احکام علل پوچھنے کی کسی کو مجال نہیں

برخلاف مسائل شرعیہ کے کہ وہ خدائی احکام ہیں اور خدا تعالیٰ فاعل مختار ہیں کوئی قانون اور کوئی حکم ان پر حاکم نہیں جس کی پابندی ان پر لازم ہو تو ان سے یا ان کے پیغام رسانوں سے اس سوال کے کوئی معنی نہیں ہوسکتے کہ تین رکعت یا چار رکعت کیوں مقرر کیں، وہاں تو علت ہر بات کی ان کا حکم ہے ان کے حکم کے لیے کوئی چیز علت نہیں ہوسکتی۔ بہرحال آپ خدا تعالیٰ سے پوچھنے والے کون ہیں کہ یہ حکم کیوں دیا جبکہ ایک طبیب سے پوچھنے کے بھی آپ مجاز نہیں اور اگر احکام شرعی میں چوں و چرا کی ہمت ہے تو پہلے طبیب سے نسخہ کے علل پوچھو(۲)۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے افسوس کیا ہے کہ اے عزیز تو محمد بن زکریا سے (ایک طبیب کا نام ہے) نہیں پوچھتا کہ یہ نسخہ کیوں لکھا اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا۔

ایک کاتب کا کارنامہ

یہاں ایک واقعہ یاد آیا میرے ایک عزیز مولوی سعید مرحوم وعظ لکھا کرتے تھے کچھ وعظوں کے مسودے ان کے ہاتھ کے ایسے رہ گئے جن کے صاف کرنے کی نوبت نہیں آئی اور ان کا انتقال ہوگیا۔ ایک کاتب اور پیدا ہوئے اور انہوں نے کہا کہ میں ان کو صاف کرلوں گا۔ ایک وعظ میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول آیا تھا انہوں نے سمجھا کہ عبداللہ سے مراد عبداللہ بن مسعود ہیں اور اس کی اصل یہ ہے کہ روایت

(۱) تمہیں کیا حق ہے (۲) علتیں۔

حدیث میں جب عبداللہ مطلق آتا ہے تو مراد عبداللہ بن مسعود ہوتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے بہت غلطیاں کیں ایسی صریح تو غلطیاں کیں اور اجرت بھی کتابت کی لے لی پھر ان کو اس کا علم بھی ہوا اور اجرت واپس نہ کی۔ بس کہہ دیا کہ میں اپنا کام کر چکا۔ یہاں سے اس کی بھی اصل نکلتی ہے کہ بعض بزرگوں کی طرف جو بعض باتیں ایسی منسوب ہیں جو خلاف شرع ہیں ممکن ہے کہ ان کو ایسے ہی کاتب مل گئے ہوں جنہوں نے عبداللہ سے مراد عبداللہ بن مسعود لیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مخالف نے الحاق کیا ہو(۱)۔ یہ تو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گیا۔ بیان یہ تھا کہ افسوس کیا ہے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کہ طبیب جسمانی کے حکم کو تو بے چون و چرا مان لیا جائے اور طبیب روحانی کے سامنے لم و کیف (۲) کیا جائے چاہیے تو یہ کہ جیسے طبیب پر اطمینان ہے کہ یہ خواص ادویہ اور طرق علاج کو جانتا ہے اور اس وجہ سے مزاحمت نہیں کی جاتی۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اعتماد کرنا لازم ہے کہ علم ''خواص اعمال'' کا رکھتے ہیں لہٰذا کیا حق ہے کسی کو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی میں مزاحمت کرے حالانکہ دونوں میں یہ فرق بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم اصل سے قطعی ہیں اور طب اصل سے ظنی ہے۔ ایک شخص ظن کو نہیں مانتا وہ دوسری تحقیق رکھتا ہے اور قطعی کے سامنے تو مزاحمت کی کوئی گنجائش ہی نہیں (جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ طب کو جو ظنی کہا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام طبی تحقیقات ظنی ہیں کیونکہ بعض طبی تحقیقات قطعی بھی ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اکثر احکام طبی ظنی ہیں۔ وللاکثر حکم الکل (۳) تو جب ظنی علوم سے مزاحمت نہیں کی جاتی تو قطعی علوم سے مزاحمت کیسے جائز ہوگی۔

بعض اعمال کے خواص کا عقل ادراک نہیں کر سکتی

یہ فائدہ میری اس تقسیم سے نکلا کہ اعمال کی دو قسم ہیں ایک وہ جن کے خواص عقل سے معلوم ہو سکتے ہیں ان میں مزاحمت کی گنجائش ہو سکتی ہے اور ایک وہ جن کے خواص کے ادراک کے لیے عقل کافی نہیں بلکہ وہ صرف مدرک بالوحی (۴) ہیں ان میں

(۱) کسی مخالف نے وہ مضمون اس میں داخل کر دیا ہو (۲) کیوں اور کیسے سوالات کئے جائیں (۳) اکثریت کو دیکھ کر کل پر حکم لگاتے ہیں (۴) صرف وحی سے معلوم ہوتے ہیں۔

مزاحمت کی مطلق گنجائش نہیں اور ایک یہ مسئلہ بھی حل ہوا کہ بعض اعمال پر خاص وعدے یا وعیدیں مثلاً فلاں سورت کوئی پڑھے تو جنت میں اس کو یہ چیزیں ملیں گی یا فلاں گناہ کرے تو جہنم میں یہ عذاب ہوگا ان میں عوام کو اور بعض علماء کو دونوں کو ایک غلطی ہوتی ہے اہل علم کو توجیہ میں دقت ہوتی ہے۔ طالب علم پوچھتے ہیں کہ اس عمل اور اس کی جزا میں بہت مناسبت کیا ہے۔ مثلاً وارد ہے کہ ایک بار سبحان اللہ کہنے سے ایک درخت جنت میں لگ جاتا ہے تو تسبیح اور درخت میں مناسبت کیا ہے، اساتذہ اس کی توجیہیں کرتے ہیں مگر طلبہ کی تشفی نہیں ہوتی۔ میری تقریر سے تمام توجیہات کا اصل الاصول نکل آیا کہ یہ ان باتوں میں سے ہے جن کا علم صرف بذریعہ وحی ہوا ہے عقل ان کے ادراک سے قاصر ہے یہ توجیہ ہر جگہ ملتی ہے اس کو تو ضرور تسلیم کرادیا جائے اس کے بعد اگر کوئی توجیہ بطور تقریب الی الفہم (۱) کی جائے تو مزید تسکین کا مؤجب ہوگی اور درحقیقت ہے بھی یہی بات۔ اور بدون اس اصل کے مناسبت کی حقیقت سمجھانے کا دعویٰ کرنا تکلف ہی تکلف اور نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر چیز کی حقیقت ہماری عقل میں آہی جائے۔

علوم شرعیہ کو مدرک بالوحی مان لینے کا عظیم نفع

بلکہ ترقی کرکے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت واقعیہ کسی چیز کی بھی ہم کو معلوم نہیں بس ہم کو ایک حد پر قناعت ہوگئی ہے اس وجہ سے آگے تلاش نہیں کرتے اور جس حد کا علم ہوگیا ہے اسی کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ حتی کہ ہم اپنی ذات اور افعال تک کی حقیقت واقعیہ نہیں جانتے، آنکھ سے ہر وقت دیکھتے ہیں مگر اس کی حقیقت نہیں بتاسکتے کہ دکھائی کس طرح دیتا ہے اس کی حقیقت سے صرف اسی درجہ پر قناعت کرلی ہے کہ آنکھ کھولتے ہیں تو چیز دکھائی دے جاتی ہے اور اس پر ایسا شرح صدر ہے کہ اس میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا اور نہ ذہن اس سے آگے کبھی جاتا ہے اور اس کو بدیہی سمجھتے ہیں جس کے لیے دلیل کی احتیاج ہی نہیں یہ اس قناعت ہی کا نتیجہ ہے ورنہ جن لوگوں نے اس کی تحقیق کرنی چاہی ان کو دیکھئے کس مصیبت میں پڑگئے اور اس مسئلہ میں کتنے اقوال ہوگئے پھر

(۱) سمجھانے کے لیے کردی جائے۔

بھی جس کو تحقیق کہتے ہیں وہ حق نہ ہوئی اس سے وہ قناعت ہی اچھی تھی اسی طرح علوم شرعیہ کو مدرک بالوحی مان لینے سے بہت سے بکھیڑوں سے نجات مل جاتی ہے اور اس کے بعد کوئی توجیہ مناسب بھی کر دی جائے تو مزید اطمینان کا باعث ہے تو یہ بیان اہل علم کی غلطی کا ہوا۔

عوام کی سستی اعمال کا سبب

اور عوام کو بعضے وعدوں سے یہ غلطی ہوتی ہے کہ ایک بہانہ مل جاتا ہے اعمال میں سستی کے لیے مثلاً وارد ہے۔ ''مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّة''(۱) اس سے اطمینان کر لیا کہ جب ہم کلمہ پڑھتے ہیں تو جنت واجب ہے ہی پھر اعمال کی کیا ضرورت ہے۔ اس وجہ سے اعمال میں سستی ہونے لگی اور یہ سستی صرف ان پڑھوں میں ہی نہیں بلکہ آج کل پڑھے لکھوں میں بھی یہ غلطی کثرت سے ہونے لگی۔ چنانچہ مدعیان عقل کہتے ہیں کہ انسان کا کام ترقی دنیا ہے اور رہی آخرت تو اس کے لیے پیغمبر صاحب فرما گئے ہیں: ''مَنْ قَالَ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ'' اور کلمہ ہم پڑھتے ہی ہیں اور حضور کے فرمانے پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ لہٰذا جنت ضرور ملے گی پھر دنیا کی ترقی کو کیوں چھوڑا اور جواز و ناجواز (۲) کے جھگڑے میں کیوں پڑے، پس جو چاہو کرو، سود لو یا رشوت اور کلمہ پڑھتے رہو اور بعض کو تو اس دعوے کا ایسا ہیضہ ہوا ہے کہ انہوں نے رسالت کی بھی ضرورت نہیں رکھی۔

لا الہ الا اللہ سے مراد

کہتے ہیں: حدیث میں ہے: ''مَنْ قَالَ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ'' اس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے یہ مولویوں کا اضافہ ہے رسالت کا قائل ہونا ضروری نہیں، گو اچھا ہے اور غضب یہ ہے کہ یہ مضامین ان لوگوں نے مذہبی کتابوں میں چھاپ دیئے جن سے مسلمانوں کے ہوش اڑتے ہیں اور بعض نے اس سے بھی ترقی کی کہ توحید کے اختیار کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ دعویٰ کیا کہ توحید تو امر فطری ہے اور ہر شخص میں موجود ہے۔ اگر زبان سے نہ بھی کہے گا بلکہ اگر انکار کرے گا

(۱) کنز العمال: ۲۰۸ (۲) جائز و ناجائز۔

تب بھی وہ موحد ہے اور موافق اس حدیث کے اس کو نجات ہوجائے گی۔ بس ان لوگوں کے نزدیک ضروری کام صرف یہ رہ گیا کہ کھانے پینے کی ترقی کرو۔

صاحبو! یہ لوگ ہیں جن کے بارے میں خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ۔(۱)

اور ان لوگوں سے سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ

فسوف ترى اذا انكشف الغبار افرس تحت رجلك ام حمار(۲)

یہ نہیں دیکھتے کہ اگر فطری توحید کافی ہو تو بعثت انبیاء علیہم السلام عبث ہوجاتی ہے(۳)۔ خواہ مخواہ کیوں اتنا بکھیڑا کیا گیا فطری توحید سے نجات تو سب کی ہو ہی جاتی۔

صاحبو! حقیقت یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ سے مراد پورا کلمہ ہے آدھا کلمہ مراد نہیں اور جن لوگوں نے اس سے آدھا کلمہ ہی مراد سمجھا ہے ان کی سمجھ بس ویسی ہے جیسے ریاست رام پور میں ایک طالب علم تھا، اس نے مجھ سے کسی پریشانی کے لیے وظیفہ پوچھا میں نے بتلادیا کہ لاحول کی کثرت کرو، چند روز کے بعد وہ ملا اور بیان کیا کہ میں لاحول لاحول لاحول تمہارا بتلایا ہوا برابر پڑھتا ہوں مگر ثمرہ مرتب نہیں ہوا، میں نے کہا لاحول ولاقوۃ تو جیسے لاحول سے میری مراد پورا جملہ تھا ایسے ہی لا الہ الا اللہ سے مراد پورا کلمہ مع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ غرض یہ تو محض وابیات اور غلط ہے کہ اعتقاد ورسالت کی ضرورت نہیں ہے یا توحید فطری کافی ہے اس کے متعلق کلام کو طول دینا فضول ہے کیونکہ اس وقت مخاطبین میں کوئی اس خیال کا نہیں لیکن افسوس ان پر ہے جو رسالت کی ضرورت کو مانتے ہیں اور اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ کلمہ پڑھنے کو کافی سمجھتے ہیں اور اعمال کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کے زعم(۴) میں ایک حدیث سے تائید مل گئی ہے وہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے اس کے آخر جزو سے ان کو دھوکہ ہوا ہے وہ جزو یہ ہے ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ'' (اور اگر زنا کرے یا اگر چوری کرے) حدیث کا قصہ یہ ہے

(۱) ''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو اپنے حال پر رہنے دیجئے کہ وہ خوب کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں، ان کو اپنی حقیقت معلوم ہو ہی جاتی ہے'' سورۃ الحجرات: ۳ (۲) ''جب غبار ہٹ جائے گا عنقریب معلوم ہوجائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر'' (۳) نبی کو مبعوث کرنا ہی بیکار ہوجاتا ہے (۴) گمان۔

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ'' (جس شخص نے لا الہ الا اللہ ''اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں'' کہا وہ شخص جنت میں داخل ہوا''۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ ''(اور اگر زنا کرے یا اگر چوری کرے) یعنی اگرچہ مومن سے معاصی بھی صادر ہوں، کیا تب بھی وہ جنت میں جائے گا۔ حضور نے فرمایا ہاں! ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ ''(اور اگر زنا کرے یا اگر چوری کرے) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پھر پوچھا ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ'' ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ ''(اور اگر زنا کرے یا اگر چوری کرے) انہوں نے پھر تعجب سے یہی پوچھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی جواب دیا اور اتنا لفظ اور بڑھایا: ''عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ'' یعنی چاہے ابوذر کی طبیعت کے کتنا ہی خلاف ہو مگر ہوگا یہی کہ وہ جنت میں جائے گا۔ اس حدیث کے الفاظ ظاہراً بہت صریح ہیں۔ وہ حدیث جو اوپر پڑھی تھی یعنی ''مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ''(۱) وہ بھی اتنی صریح نہ تھی اور یہ حدیث عام لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہے ورنہ خدا جانے کیا کرتے۔ میں نے ناحق ہی پڑھی کہ ان کے ہاتھ ایک دلیل آ گئی مگر خیر اس پر مکمل بحث ہونے سے ان شاء اللہ تعالیٰ تحقیق ہو جائے گی اور غلطی نکل جائے گی اور یہ کچھ چھپی ہوئی حدیث تو ہے بھی نہیں نیز شریعت کا یہ حکم بھی نہیں ہے کہ کوئی مسئلہ چھپایا جائے۔ کتابوں میں تو یہ موجود ہے ہی، طلباء اور اہل علم اس کو جانتے ہیں ہاں تحقیق ہو جانے سے امید ہے کہ پھر کتاب میں دیکھ کر بھی غلطی نہ ہوگی اور آج کل تو اس کا علم طلبہ تک بھی محدود نہیں رہا، عوام کے سامنے اور گھروں کے اندر بھی حدیثیں پہنچ گئیں۔

اردو ترجمہ از خود دیکھنے کی خرابیاں

بی ترجمہ بیگم کا سر سلامت چاہیے انہوں نے گھروں کے اندر بھی باریک سے باریک مسائل کو پہنچا دیا ہے۔ ترجمہ کو اردو میں دیکھ کر ایسا آسان سمجھا جاتا ہے کہ کسی

(۱) ''جس نے لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں) کہا وہ شخص جنت میں داخل ہوا'' کنز العمال: ۲۰۸۔

سے اسے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور اس سے بڑی بڑی غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ طب کی کتابیں بھی تو اردو میں ہوگئی ہیں پھر چاہیے کہ معالجہ کو بھی ایسا ہی سہل سمجھا جائے جیسا حدیثوں کو ترجمہ سے سہل سمجھ لیا گیا تو بس خود علاج کرلیا کریں اور طبیب کی طرف رجوع کی ضرورت نہ سمجھی جائے یا قانون بھی اردو میں موجود ہے تو چاہیے کہ وکیل کی بھی ضرورت نہ سمجھیں حالانکہ ہم نے کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ ایک نسخہ زکام کا بھی کتاب میں دیکھ کر بلاطبیب کے مشورہ کے یا ایک کرایہ نامہ بھی بلامشورہ وکیل کے لکھا ہو۔ کوئی وجہ فرق تو بیان کی جائے۔ بس فرق یہی ہے کہ دنیا کے کاموں کی وقعت ہے ان میں بدوں مہارت کاملہ کے دخل دینا پسند نہیں کرتے اور دین کی وقعت ہے نہیں، اس میں ہر شخص مجتہد بنا ہوا ہے۔ بہرحال ظاہر میں اس حدیث کے ترجمہ کو دیکھ کر ضرور یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ کلمہ پڑھ لینا کافی ہے اگرچہ کیسے ہی گناہ کرے جب بھی جنت میں جائے گا اور پھر گناہوں میں سے بھی زنا اور سرقہ کا نام لیا گیا جو کبیرہ اور متفق علیہ گناہ ہیں پھر اس کے ساتھ حدیث کا اردو ترجمہ سہل ہے ہی اب اس کے متعلق کسی سے پوچھنے اور مشورہ کرنے کی کیا ضرورت رہی۔

اعمال کو ضروری نہ سمجھنے کا الزامی جواب

بس ثابت ہوگیا کہ اعمال کی ضرورت نہیں اور اس کے یہ معنی ہوئے کہ علماء نے ناحق فقہ کی وہ کتابیں لکھی ہیں جن میں اعمال کا بیان ہے اور فضول اس میں عمریں صَرف کی ہیں کہ کہیں متن ہے اور کہیں شروح ہیں اور کہیں حواشی ہیں اور جابجا مبسوط بحثیں ہیں اور واقعی میں یہ غلطی علماء ہی تک محدود نہ رہے گی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے گی کیونکہ علماء تو صرف واسطہ ہیں علوم کے پہنچانے کے اور اصل علوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشاد فرمودہ ہیں سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ایک جگہ تو یوں ہے: ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ'' اور دوسری جگہ موجود ہے: ''لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنْ کِبْرٍ'' (۱) جس کا مطلب یہ ہے کہ ذرا سی بدعملی سے بھی جنت

(۱) الصحیح لمسلم کتاب الایمان ب:۳۹۔

سے محرومی ہوگی وہاں تو یہ کہ کسی عمل سے کلمہ گو جہنم میں نہیں جاسکتا اور یہاں یہ کہ ذرہ برابر برے عمل سے جنت نہیں پاسکتا، یہ تعارض کیسا۔ ایک تو ان لوگوں کے قول پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض، دوسرے یہ کہ اعمال کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے تعلیم فرمائی ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا سکھلائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو واسطہ ہیں اللہ تعالیٰ نے سکھلائے ہیں۔ تو یہ اعتراض اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے کہ ادھر تو اپنے رسول کی زبان سے یہ وعدہ کیا کہ کلمہ پڑھ لینا کافی ہے اور ادھر اعمال کو بھی ضروری بتلایا جوان کے نزدیک ضروری نہیں، کیا یہ صریح تعارض نہیں اس بناء پر تو یہ چاہیے تھا کہ تمدن سکھلاتے جیسا کہ مدعیان تمدن کا خیال ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا نے ان لوگوں کے قلوب کو چرایا ہے۔ بس اسی کی ضرورت ان کے قلب میں آتی ہے دین کی ضرورت قلب میں آتی ہی نہیں مگر اس کا صریح انکار بعض مصالح سے نہیں کرسکتے اس واسطے اس کے متعلق کچھ من سمجھوتہ (۱) کرلیتے ہیں اور ادنیٰ سے تاویل پر خواہ وہ بداہۃً غلط ہو (۲) قناعت کرلیتے ہیں۔ بس مقصود دنیا ہے اور اس کو اپنا کام تو سمجھتے ہی ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا اصل کار منصبی دین ہے

غضب یہ ہے کہ مذہبی لوگوں کا اور انبیاء علیہم السلام کا بلکہ حق تعالیٰ کا کام بھی اسی کو سمجھتے ہیں کہ تمدن سکھلائیں۔ دین کا کہیں نام بھی لیتے ہیں تو وہ صرف تمدن کی ضرورت سے، چنانچہ اگر کبھی دین کی تعریف ہوتی ہے تو یہ کہ سبحان اللہ ہمارا کیسا دین ہے جس نے نماز سکھلائی تو جماعت کے ساتھ، تاکہ آپس میں میل جول ہو، مال میں بھی حقوق رکھے تاکہ غریب اور امیر میں تعلق رہے، حج کی تعلیم دی تاکہ ایک مرتبہ سال میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع ہوجایا کرے اور تمدن قائم رہے۔ غرض تمدن ہو چاہے کچھ بھی نہ ہو۔ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ ان احکام شرعیہ میں رعایت ان مصالح کی بھی ہو مگر ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ مصلحت حکمت کے درجہ میں ہے علت کے درجہ میں نہیں ورنہ ایسے احکام دین میں کیوں ہیں جن کو تمدن سے علاقہ نہیں مثلاً وضو کرنا روزہ رکھنا رات کو اٹھ کر تہجد پڑھنا کہ ان اعمال میں

(۱) دلی سمجھوتہ (۲) واضح طور پر غلط ہو۔

تو تکلیف ہی تکلیف ہے ترقی قوی اور تمدن میں بظاہر ان کو کوئی دخل نہیں اور یوں بہت سے وسائط سے تو ہر کام کو ہر نتیجہ سے مربوط کیا جاسکتا ہے۔ خوب یاد رکھئے کہ دین کا مقصود اصلاح دنیا نہیں ہے اور بالتبع اصلاح ہوجانا اور بات ہے۔ یہ خوبی ہے دین کی کہ دنیا کی اصلاح بھی اس سے لزوماً ہوجاتی ہے مگر مقصود ہرگز نہیں ہے اور نہ اصلاح دنیا علماء کا منصبی کام ہوسکتا ہے نہ انبیاء علیہم السلام کا بلکہ انبیاء علیہم السلام کا اصلی کام صرف دین ہے۔

نبوت کا اصل کام سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام سے لیا گیا

یہاں سے اس کا جواب بھی نکل آیا کہ قیامت کے احوال سے گھبرا کر لوگ یہ تجویز نکالیں گے کہ کسی سے شفاعت کرائیں اور اس کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو انتخاب کریں گے کیونکہ وہ سب کے باپ ہیں اور صفی اللہ ہیں۔ چنانچہ ان کے پاس جائیں گے اور شفاعت کی درخواست کریں گے آپ عذر کریں گے اور فرمائیں گے کہ نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ کیونکہ وہ اول نبی ہیں۔ یہ حدیث بہت طویل ہے یہاں عرض کرنا صرف اتنا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اول نبی کہنا کیا معنی ان سے پہلے تو متعدد نبی ہوچکے ہیں خود حضرت آدم علیہ السلام بھی نبی ہیں جو خود ایسا کہہ رہے ہیں۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اپنی نبوت سے بھی انکار ہے۔ اس کا مطلب میری تقریر سے بے غبار نکلتا ہے کہ ان کو اول نبی اس واسطے کہا گیا کہ نبوت کا جو اصل کام ہے وہ سب سے پہلے ان ہی سے لیا گیا یعنی تعلیم دین محض۔

بعض انبیاء علیہم السلام کے تعلیم الصنائع کی وجہ (۱)

اور ان سے پہلے جو نبی تھے انہوں نے دنیا کی بھی تعلیم کی تھی چنانچہ حضرت ادریس علیہ السلام نے سینے کا فن سکھلایا، وعلی ہذا ضروری صنائع کی تعلیم بذریعہ وحی ہوئی ہے اس وقت ضرورت تھی تمدن کی تعلیم کی بھی جب وہ ضرورت پوری ہوچکی تو اس کی تعلیم کو حذف کردیا گیا اور صرف تعلیم دین رہ گئی اور اس تعلیم کا شروع حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے ہوتا ہے اس واسطے ان کو اول نبی کہا گیا اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ تعلیم

(۱) بعض انبیاء کو بعض صنعتوں کی تعلیم کی وجہ۔

دنیا بھی بقدر ضرورت ہوئی ہے مگر نبوت کا یہ اصلی کام نہیں ہے ہاں ضرورت کی وجہ سے اس کی اجازت ہے اور اس پر مدت تک عمل بھی رہا اس سے تعلیم دنیا کی تعلیم دین کے ساتھ برابری ہرگز لازم نہیں آتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بہت بڑا حاکم مثلاً وائسرائے ہے کہ اس کا اصلی کام انتظام ملکی ہے لیکن اگر کہیں ضرورت پڑ جائے اور کوئی خادم موجود نہ ہو اور اس وجہ سے اس کو اور کام بھی مثلاً کھانا پکالینا یا کپڑا سی لینا وغیرہ کرنا پڑ جائے اب اگر کوئی اس کو یہ کام کرتے ہوئے دیکھے اور کپڑے سینے اور کھانے پکانے کو وائسرائے کا کار منصبی سمجھنے لگے یا ان کاموں کو انتظام کے برابر قرار دینے لگے تو خام خیالی ہوگی یا نہیں۔ اسی طرح محض یہ دیکھ کر کہ کسی وقت تعلیم دنیا کی انبیاء علیہم السلام نے کی تھی اس کو نبوت کی اصلی غرض کہنا یا اس کو تعلیم دین کے برابر سمجھنا ضرور خام خیالی اور غلطی ہے۔ آج کل بعض لوگ اس کو دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ تعلیم صنائع آدم علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام نبیوں نے کی ہے تو مولوی کیوں نہیں کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان کی اتباع سے یہ شوق پیدا ہوا ہے تو جس نسبت کو انہوں نے محفوظ رکھا تھا وہی نسبت محفوظ رکھ کر آپ بھی مولویوں سے ان کاموں کو کرا سکتے ہیں اور بہت خوشی سے اس کی اجازت ہے وہ نسبت یہ ہے کہ تعلیم دنیا کو ان حضرات نے اصل مقصود اور منتہائے نظر نہیں قرار دیا تھا بقدر ضرورت تعلیم کی اور جب ضرورت پوری ہوگئی تو تقسیم عمل کا مسئلہ شروع ہوگیا کہ انبیاء علیہم السلام کے ذمہ سے اس کو الگ کر دیا گیا اور ان کو اس کام میں لگا دیا جو نبوت کا اصلی کام تھا اب ان کی تقلید کی صورت یہی ہے جو علماء کر رہے ہیں کہ خود اس کام میں لگے ہوئے ہیں جو ان کا اصلی کام ہے اور دنیا کی تعلیم اوروں کے حوالہ کر دی ہے۔

مصلح کا اصل کام تعلیم دین ہے

علماء نائب انبیاء علیہم السلام ہیں جو طریقہ ان کا تھا وہی ان کا ہونا چاہیے ان کی تقلید یہ کیسے ہوئی کہ اہل دنیا میں بھی دنیا کی تعلیم دیں اور اہل دین بھی دنیا ہی کی تعلیم دیں۔ آخر اس صورت میں دین کی تعلیم دینے کون آئے گا۔ شاید فرشتے آئیں گے لیکن اگر ایسا ہوا تو ان کے متعلق بھی مصلحان قوم کا فتویٰ یہی لگے گا کہ ان کو بھی تمدن ہی

سکھلانا چاہیے۔ غرض دین کا نام نہ آنے پائے۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ طریقہ تو یہ، اور دعویٰ انبیاء علیہم السلام کی تقلید کا۔ حضرت ان کی صحیح تقلید یہی ہے کہ دنیا کی تعلیم قدر ضرورت سے آگے نہ بڑھائی جائے اور یہ کہ اصلی کام مصلح کا تعلیم دین سمجھا جائے اور دنیا کی تعلیم دنیا والوں کے حوالہ کی جائے۔ نیز یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ انہوں نے تعلیم دنیا کس وقت میں کی جس وقت اسکی ضرورت تھی اور انسان کو کسی ذرا سی حاجت کا پورا کرنا نہیں آتا تھا۔

صنعت گری کا پہلا استاد کوا ہے

دیکھو قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو اتنی بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس کی لاش کو کیسے چھپاؤں، کرنے کو تو کر گیا مگر اب اس کا چھپانا مشکل ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سال بھر تک لاش کندھے پر لادے پھرا اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی، جس کو کوئی آدمی جانتا نہ ہو وہ چاہے واقع میں کیسا ہی آسان کام ہو مگر مشکل ہوتا ہے۔ دیکھئے منہ میں لقمہ رکھنا بھی کام ہے مگر بچہ کتنے دنوں میں سیکھتا ہے۔ غرض بہت پریشان تھا اور ڈرتا تھا کہ آدم علیہ السلام کو خبر نہ ہو جائے، دو کوے لڑتے ہوئے آئے، قرآن شریف میں ہے کہ حق تعالیٰ نے ان دو کووں کو بھیجا، اللہ اللہ گناہ کے بعد بھی حق تعالیٰ ہی کی رحمت کی ضرورت ہوتی ہے یہ ان ہی کی شان ستاری ہے کہ گناہ گار کو فضیحت سے بچنے کی تدبیر بھی خود ہی بتاتے ہیں:

گنہ بیند و پردہ پوشد بحلم (۱)

غرض ایک کوے نے دوسرے کو مار ڈالا، پھر چونچ سے زمین کو کرید کر گڑھا کر کے اس میں اس کو سر کا کر مٹی برابر کر دی، تب قابیل کی سمجھ میں آیا کہ یہ تدبیر عیب چھپانے کی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی خود بھی کیا اور اس بار سے سبکدوش ہوا(۲) اور بہت ہی خفیف (۳) ہوا کہ اتنی سی بات بھی مجھے نہ آئی۔ دیکھئے انسان اس وقت اپنی ضروریات کے پورا کرنے سے اس قدر عاری تھے ایسے وقت میں حق تعالیٰ نے بذریعہ انبیاء علیہم السلام کے دنیا کی ضروریات کا علم بھی دیا۔ اس وقت پر قیاس کرنا محض غلط ہے جب وہ

(۱) ''گناہ دیکھتا ہے اور حلم سے پردہ پوشی کرتا ہے'' (۲) اس بوجھ سے جان چھوٹی (۳) شرمندہ۔

ضرورتیں پوری ہوگئیں تو منصب نبوت سے ان کو الگ کرلیا گیا اور اس قصہ سے معلوم ہوا کہ صنعت میں کوا قابیل کا بھی استاد ہے۔کوے کی تو اہل صنعت کو بہت قدر کرنی چاہیے۔ یہ کوے جو آج کل ہیں وہ اصل موجد نہ سہی مگر اس کے ہم جنس تو ہیں اور ممکن ہے اسی کی نسل کے ہوں تو یہ استاد زادے ہوئے ان کی تو آؤ بھگت کیا کریں ان کو مارنا بھگانا برا بھلا کہنا چاہیے، (مسکرا کر) عورتیں ان کو بہت برا بھلا کہتی اور کوستی رہتی ہیں۔ (وجہ یہ کہ کام بھی ان ہی کو ان سے زیادہ پڑتا ہے، آٹا نوچ کر لے جاتے ہیں، روٹی پکانا دشوار کردیتے ہیں) خیر یہ تو لطیفہ تھا اصل بیان یہ تھا کہ یہ مسلم ہے (۱) کہ اکثر صنعتوں کا علم بھی وحی سے ہوا مگر سخت ضرورت کے وقت ہوا جب بقدر ضرورت حاصل ہوگیا تو اس کو منصب نبوت سے الگ کردیا گیا۔ اس واسطے نوح علیہ السلام کو اول نبی کہا گیا کہ ان سے اس کی ابتداء ہوئی۔ تو اگر دنیا ہی مقصود ہے تو دین کی تعلیم کے لیے انبیاء علیہم السلام کو کیوں بھیجا، اتنے بکھیڑوں میں کیوں ڈالا۔ کہیں حکم ہے وضو کرو، کہیں صبح سویرے اٹھو، جاڑے (۲) میں مرتے ہوئے مسجد میں جاؤ، میٹھی میٹھی نیند کھوؤ۔ بس کافی تھا کہ لا الہ الا اللہ بتادیتے، احکام بالکل نہ ہوتے، آزاد پھرا کرتے بلکہ لا الہ الا اللہ کی بھی ضرورت نہ تھی جیسے اس محقق نے کہہ دیا کہ توحید فطری ہے جس کے سکھلانے کی بھی ضرورت نہیں تو کارخانہ رسالت ہی (نعوذ باللہ) سب فضول و بیکار رہا کیونکہ جو امر فطری ہے اس کو طبیعت خود سکھالیتی ہے۔ ایک نبی کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (۳) یہ تو الحاد اور زندقہ ہے۔ اس وقت مجمع اہل اسلام کا ہے اس واسطے اس مضمون کو میں طول نہیں دیتا اور مسلمانوں کی ضرورت کی بات بتلاتا ہوں۔

کلمہ طیبہ کی فضیلت

وہ یہ کہ جیسا حدیث میں آیا ہے کہ جو کوئی لا الہ الا اللہ کہے وہ جنت میں جائے گا ایسے ہی دوسری طرف محکمہ رسالت بھی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ وہ عبث نہیں، تو ماننا پڑے گا کہ لا الہ الا اللہ کہنے پر جنت پر موعود ہونے کے معنی کچھ اور ہیں اور وہ معنی بیان کرنے

(۱) یہ بات تسلیم شدہ ہے (۲) سردی میں (۳) ''ہم سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں''۔

سے پہلے میں ایک مثال دیتا ہوں اس سے بخوبی یہ مضمون ذہن نشین ہوجائے گا وہ یہ کہ اطباء کہتے ہیں کہ بیضہ نیم برشت مولد(۱) خون ہے اور یہ اطباء کا متفق علیہ مسئلہ ہے اور تجربہ سے بھی ثابت ہے کہ جس کے بدن میں خون کم ہوگیا ہو وہ اس کو چند روز استعمال کرے تو بدن حالت اصلی پر آجاتا ہے اور رنگ وروپ نکل آتا ہے۔ یہ سب خون کے پیدا ہونے کے آثار ہیں اب فرض کیجئے کہ ایک شخص بہت سے انڈے کھانا شروع کرے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کرتا رہے کہ روز مرہ فصد کھلواتا رہے(۲) اور وہ ایک سال تک ایسا ہی کرے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اس کا جسم بڑھے گا یا گھٹے گا۔ ظاہر ہے کہ بڑھے گا نہیں گھٹے ہی گا بلکہ مرجائے گا۔ اب فرض کرو کوئی دیکھنے والا اگر یہ کہے کہ انڈے میں تو تولید خون(۳) کی خاصیت تھی وہ کہاں گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ طبی تحقیق غلط ہے تو اس کا جواب ہر شخص یہی دے گا کہ بیضہ میں تو خاصیت تولید خون(۴) کی بیشک تھی مگر وہ اس وقت ظاہر ہوسکتی تھی جبکہ اس کی شرط بھی پائی جاتی اور منافی کا وجود(۵) نہ ہوتا اور جبکہ وہ فصد سے خون(۶) نکالتا رہا تو بیضہ کہاں تک کافی ہوسکتا تھا۔ ایک طرف سے حوض میں پانی ڈالا جائے اور دوسری طرف سے اس سے بڑا پرنالہ پانی نکلنے کے لیے کھول دیا جائے تو وہ حوض تو قیامت تک بھی نہ بھرے گا۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اوپر سے پانی نہیں آرہا تھا ہرگز نہیں۔ پانی بے شک آرہا تھا مگر حوض بھرا اس لیے نہیں کہ اس سے زیادہ نکل رہا تھا اور پانی کے آنے سے حوض بھر جانے کی شرط یہ تھی کہ نکلنے کا سوراخ نہ ہوتا، سوراخ کا کھلنا بھرنے سے مانع ہوگیا۔ جب شرط موجود ہو اور مانع مرتفع ہو(۷) تب بھرنے کا ترتب ہوسکتا ہے اور مانع کے موجود ہوتے ہوئے یا تو اثر باطل ہوجائے گا یا ضعیف ہوجائے گا۔ جیسا مانع ہو۔

کلمہ طیبہ کے حصول خواص کے ضروری شرائط

پس ثابت ہوا کہ ہر چیز کے اثر کے لیے تحقیق شرط اور ارتفاع مانع ضروری ہے(۸)

(۱) نیم برشت انڈا کھانے سے خون پیدا ہوتا ہے (۲) روزانہ فصد لگوا کر خون نکلواتا رہے (۳) خون پیدا کرنے کی خاصیت تھی (۴) انڈے میں تو خون پیدا کرنے کی صلاحیت تھی (۵) اس کے خلاف کا وجود نہ پایا جائے (۶) جبکہ پچھنے لگوا کر خون نکالتا رہے تو انڈا کہاں تک کام کریگا۔ (۷) جب شرط پائی جائے اور رکاوٹیں دور ہوجائیں (۸) اثر ہونے کے لیے شرط کا وجود اور رکاوٹوں کو دور ہونا ضروری ہے۔

تو حضور کے اس ارشاد ''مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ'' (جس شخص نے لا الہ الا اللہ ''اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں'' کہا وہ شخص جنت میں داخل ہوا) کا یہ مطلب کیوں نہیں لیا جاتا کہ اس میں تو خاصیت یہی ہے کہ جنت میں لے جائے مگر اس کے لیے کچھ شرائط اور موانع بھی ہیں۔ اگر موانع کا وجود یا شرائط کا فقدان (۱) ہوا تو اس کے وجود یا فقدان کے درجہ کے موافق یہ اثر ہوگا کہ لا الہ الا اللہ کا اثر باطل یا ضعیف ہوجائے گا (۲) اگر پورا معارض موجود ہوگیا جیسے کفر وشرک تو اس کا اثر بالکل باطل ہوجائے گا اور اگر پورا معارض موجود نہ ہوا جیسے معاصی (۳) تو اثر ضعیف ہوجائے گا۔ یہ تو اس معارض کا اثر ہے اور لا الہ الا اللہ کا اثر یہ ظاہر ہوگا کہ انجام کار جنت میں پہنچے گا۔ اب یہ مسئلہ بالکل بے غبار ہوگیا۔ خلاصہ یہ کہ لا الہ الا اللہ کا پورا معارض (۴) تو کفر ہے قولاً یا اعتقاداً اگر کوئی ساری عمر لا الہ الا اللہ کہتا رہا مگر کلمہ کفر بھی بکتا رہا یا کوئی عقیدہ کفر کا رہا تو بوجہ وجود قوی مانع کے لا الہ الا اللہ کا کچھ اثر نہیں ہوسکتا جیسے انڈے کھانے کے ساتھ فصد کھلوانے سے انڈے کا کوئی اثر نہ ہوسکا اور ناقص معارض گناہ ہیں اگر کوئی کلمہ پڑھنے کے ساتھ گناہوں میں بھی مبتلا ہو تو لا الہ الا اللہ کا اثر ضعیف ہوجائے گا لیکن کچھ نہ کچھ رہے گا اور وہ اس طرح ظاہر ہوگا کہ اول گناہوں کی سزا ہوگی پھر لا الہ الا اللہ کا اثر ظاہر ہوگا اور دخول جنت نصیب ہوگا۔

ہر عمل کے الگ الگ خواص

خلاصہ یہ ہوا کہ اعمال میں جدا جدا خاصیت ہے اور اپنا اپنا اثر سب کرتے ہیں ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہ رہا جس میں یہ ہے: ''مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ'' وہ بھی ٹھیک ہے اور جس میں یہ ہے: ''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ'' (۵) وہ بھی ٹھیک ہے کلمہ کا وہ اثر ہے اور کبر کا یہ اثر ہے۔ ایمان موجب (۶) دخول جنت ہے اور کبر مانع دخول (۷) جنت تو اگر مانع ایسا قوی ہوا کہ پورا

(۱) اگر رکاوٹیں موجود ہوں اور شرط پائی نہ جائے (۲) ختم یا کمزور ہوجائے گا (۳) گناہ (۴) اثر کو مکمل ضائع کرنے والا تو کفر ہے (۵) ''جس کے دل میں ذرہ برابر کبر ہے وہ جنت میں داخل نہ ہوگا'' الصحیح لمسلم کتاب الایمان ب: ۳۹ (۶) جنت میں داخلہ کا باعث (۷) جنت میں داخل ہونے سے رکاوٹ کا باعث ہے۔

معارض ایمان کا ہوگیا مثلاً حق تعالیٰ کی بندگی ہی سے انکار کردیا تو ایمان کا اثر باطل ہوجائے گا اور اگر ضعیف ہوا تو بقدر اپنے وجود کے اثر کرے گا اور اخیر میں غلبہ ایمان تو رہے گا بالکل سمجھ میں آتی ہوئی بات ہے مگر مدعیان عقل نے حدیث ''قَالَ لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ''(۱) میں اپنے مطلب کے واسطے ''من'' کو تو عام لے لیا کہ جو بھی لا الہ الا اللہ کہہ لے خواہ اعمال کرے یا نہ کرے اس کے لیے دخول جنت ثابت ہے لیکن اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ اسی حدیث کے دوسرے لفظ یعنی دخل الجنۃ کو عام کیوں نہیں لیا جاتا جس سے یہ معنی ہوجاتے ہیں کہ دخول جنت بیشک ثابت ہے مگر عام ہے اس سے کہ ابتداء ہو یا بعد سزا وجزا ہو جو شخص سزا پاکر جنت میں جائے تو اس پر بھی تو دخل الجنۃ صادق ہے تو نہیں سمجھتے ذرا سی بات تھی کہ لفظ من کو عام لے کر دخل الجنۃ کو بھی عام لینا چاہیے پھر کوئی اشکال نہیں مگر نہیں سمجھتے اور یاد رکھو کہ ترجمہ دیکھنے سے یہ باتیں سمجھ میں نہیں آسکتی ہیں ان کے لیے تو استاد کی ضرورت ہے۔ یہ اچھی زبردستی ہے کہ ایک ہی حدیث میں دو لفظ ہیں ایک کو عام لیا جائے اور دوسرے کو عام نہ لیا جائے یا تو دونوں کو عام لیجئے تو آپ کا مطلب ثابت نہ ہوگا اور ہمارا مطلب ثابت ہوگا اور اگر دخل الجنۃ کو خاص لیجئے دخول ابتدائی کے ساتھ تو میں بھی من قال کو خاص کروں گا یعنی شرائط کے ساتھ تب بھی ہمارا ہی مطلب ثابت ہوگا۔ اس تحقیق سے شبہ رفع ہوگیا اور بناء اس کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں حدیثوں میں ایک ایک عمل کے خواص بیان فرمائے ہیں: حدیث ہے ''مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ مِّنْ کِبْرٍ لَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّۃَ ''(۲) میں مِنْ کِبْر کی خاصیت بیان فرمائی ہے اور حدیث ''قَالَ لاَ اِلٰہَ اِلا اللّٰہُ ''میں کلمہ اسلام کی خاصیت بیان فرمائی ہے۔ کبر کی خاصیت یہی ہے کہ جہنم میں لے جائے جیسے سنکھیا کی خاصیت یہ ہے کہ کھانے والا مرجائے اور اسکی خاصیت ضرور ظاہر ہوگی کہ جس میں یہ ہوگا جنت میں نہ جائے گا مگر ایک چیز اور موجود ہے جس کی خاصیت جنت میں لے جانا ہے اور وہ اس سے زیادہ قوی ہے۔ گویا اس کا تریاق ہے اس کا اثر بھی ضرور ظاہر ہوگا اس کا نام ایمان

(۱) کنزالعمال:۲۰۸ (۲) ''جس کے دل میں ذرا برابر کبر ہے وہ جنت میں داخل نہ ہوگا'' الصحیح لمسلم کتاب الایمان ب:۳۹۔

ہے وہ اخیر میں جنت میں ضرور لے جائے گا اب دونوں پر کیا اشکال باقی رہا۔

علوم وحی میں تعارض نہیں ہوسکتا

اس تحقیق سے ساری حدیثیں اپنی اپنی جگہ پر رہتی ہیں اور کوئی کسی کے متصادم نہیں (۱) ہوتی اور کیوں نہ ہو یہ اسی پیغمبر کا کلام ہے جن کو خود خدا تعالیٰ نے تعلیم دی ہے۔ ''عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ'' تعارض بین الاقوال بدترین عیب ہے۔(۲) علوم وحی بالکل اس سے مبرہ ہیں۔ الغرض اتنی تقریر سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ اعمال میں بھی خواص ہیں جیسے ادویہ میں خواص ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح طبیب سے بیان خواص میں مزاحمت (۳) نہیں کی جاتی اسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان خواص اعمال میں مزاحمت نہیں ہوسکتی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس طرح کسی دوا کی خاص خاصیت سن کر اس کو ہر حال میں عام قرار نہیں دیا جاتا بلکہ شرائط وموانع کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے اسی طرح کسی عمل (مثلاً لا الہ الا اللہ) کی خاصیت سن کر اس کو عام سمجھنا جائز نہیں اور یہ سب تمہید تھی، اس کے سننے کے بعد مہتم بالشان ہونا اس حدیث کے مضمون کا جس کو میں نے پڑھا ہے معلوم ہوا ہوگا کیونکہ اس حدیث میں دو چیزوں کی خاصیتیں بیان فرمائی گئی ہیں جن کا علم وحی سے ہوا ہے اور یوں تو اعمال شرعی سب ہی ضروری ہیں اور سب ہی میں خواص ہیں اور ان سب کا جاننا مفید ہے کچھ ان ہی دو عمل کی تخصیص نہیں جو حدیث میں مذکور ہیں لیکن بعض وجوہ سے یہ بہت زیادہ ضروری ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں ایک وجہ تو یہ کہ فی نفسہ مہتم بالشان ہیں (۴) دوسری وجہ کہ بدون بتلائے ان کا علم نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ دونوں اس قسم کے اعمال میں سے ہیں جن کے خواص کا علم بلا وحی کے نہیں ہوتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کی طرف سے غفلت بہت ہے اور جس چیز کی طرف سے غفلت ہو اس کی تعلیم زیادہ ضروری ہوتی ہے اور جن دو چیزوں کا اس حدیث میں ذکر ہے ان میں سے ایک نافع ہے (۵) اور ایک مضر ہے

(۱) کسی سے نہیں ٹکرائی (۲) ''اقوال ایک دوسرے کے مقابل آنا سب سے برا عیب ہے'' (۳) جھگڑا نہیں جاتا (۴) قابل اہتمام (۵) ایک مفید دوسری نقصان دہ۔

اور دونوں سے غفلت ہے۔ نہ نافع سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے نہ مضر کے نقصان سے بچایا جاتا ہے۔ یہ وجوہ ہیں اس حدیث کے مضمون کے ضروری ہونے کی، اب میں ترجمہ کرتا ہوں حدیث کا اس سے تعین ہوجائے گی میرے اس وقت کے مقصود کی۔ سو سنئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اِنَّ الشَّیْطَانَ جَاثِمٌ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ آدَمَ''(۱) جثوم کہتے ہیں سینہ جما کر بیٹھنے کو، تو ترجمہ یہ ہوا کہ شیطان سینہ جمائے بیٹھا ہے ابن آدم کے قلب پر۔ جب جانور سینہ جمالیتا ہے کسی چیز پر تو اس کا پورا قبضہ ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شیطان انسان کے دل پر پورا قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ فَاِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ خَنَسَ جب آدمی ذکر کرتا ہے تو وہ ہٹ جاتا ہے واذا غفل وسوس اور جب غافل ہوجاتا ہے ذکر سے تو وہ وسوسہ ڈالتا ہے۔ نافع اور مضر(۲) دونوں جزو کا ترجمہ ہوگیا۔ ذکر اور غفلت اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ذکر میں خاصیت ہے شیطان کے ہٹانے کی اور غفلت میں خاصیت ہے شیطانی وسوسہ پیدا کرنے کی۔ یہ دو عمل ہیں یعنی ذکر وغفلت اور ان کے یہ دو اثر ہیں یعنی خنس اور وسوسہ باقی اس میں دونوں جگہ اثر کی حد مذکور نہیں، خواہ کہیں تک یہ اثر پہنچ جائیں اس بناء پر ان کا مہتم بالشان ہونا زیادہ ثابت ہوگیا کہ ذکر کا نفع جب غیر محدود ہے تو بہت زیادہ قابل اعتناء ہے(۳) اور اسی طرح غفلت کا ضرر جب غیر محدود ہے تو بہت زیادہ قابل حذر ہے(۴)۔

ذکر کی غرض دفع خطرات سمجھنے میں دو غلطیاں

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ذکر اور غفلت کے ابتدائی اثر کو بیان کیا ہے ابتدائی کی قید میں نے اس واسطے لگائی ہے کہ ذکر کی ضرورت صرف یہی نہ سمجھی جائے کہ اس سے وسوسے رفع کر لیے جائیں اور بس آج کل بہت لوگ اسی کو بڑی دوڑ سمجھتے ہیں کہ ذکر کر کے خطرات(۵) کو رفع کرلیا۔ اگر خطرات رفع ہو گئے تو بڑے کامل ہو گئے اب آگے اور کہیں کی ضرورت نہیں رہی۔ اس میں دو غلطیاں ہیں ایک یہ اگر اس کے بعد پھر خطرات آ گئے تو سمجھا کہ ہمارا حال نہایت خراب ہے اور ہمارا ذکر

(۱) تفسیر القرطبی: ۲۰/ ۲۶۲ (۲) مفید ونقصان دہ (۳) قابل توجہ (۴) بچنے کے قابل (۵) وساوس کو دور کرلیا۔

وطاعت لاشئی ہے(۱) اتنا بھی فائدہ نہیں پہنچا کہ خطرات ہی رفع ہوجائیں، اس سے یاس (۲) پیدا ہوجاتا ہے اور اس یاس سے بسا اوقات اعمال چھوٹ جاتے ہیں کیونکہ نفس کہتا ہے کہ جب ذکر وطاعت سے کچھ حاصل نہیں تو کیوں مشقت اٹھائی۔ گویا حاصل نام ہے صرف رفع خطرات (۳) کا دوسری غلطی یہ ہے کہ جب خطرات دور ہوگئے تو قناعت ہوجاتی ہے کیونکہ اس کے زعم میں مقصود حاصل ہوگیا حالانکہ مقصود اس سے بہت آگے ہے اور رفع خطرات اس کا ایک مقدمہ ہے اس واسطے کہا گیا کہ یہ ابتدائی اثر ہے اور ظاہر ہے کہ ابتدائی اثر قناعت کی چیز نہیں مثلاً اگر کسی کو طبیب منضج (۴) کا نسخہ لکھ دے تو اس کو اس پر قناعت نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ منتہائے علاج نہیں ہے بلکہ مقدمہ علاج ہے۔ منتہائے علاج آگے آرہا ہے۔

قلب سے دشمن کو نکالنے کی تدبیر

اسی طرح ذکر کا اثر یہ بے شک ہے کہ اس سے خطرات رفع ہوتے ہیں مگر یہ منتہائے مقصود نہیں خطرات دفع کرکے تو یہ دشمن کو نکالا ہے اور دشمن کو ملک سے نکالا کرتے ہیں ملک کو آباد کرنے کے لیے نہ یہ کہ نکالنا ہی مقصود اصلی اور منتہائے نظر ہے۔ تو تعجب ہے کہ ذکر سے رفع خطرات کرکے اسی پر قناعت کرلی جائے۔ شیطان کو ہٹایا تو تھا تعمیر باطن کے لیے پھر اس پر بس کیوں کرلیا۔ اب ملک خالی ہوا ہے اغیار سے تو اطمینان کے ساتھ اس کو آباد کرو اور باغ لگاؤ وہ باغ کیا ہے، اعمال صالحہ کا باغ ہے اب باغ لگاؤ کھیتی کرو جب تک دشمن موجود تھا اس وقت تک ان کا کچھ لطف نہ تھا کیونکہ ادھر آپ نے باغ لگایا اور کھیت تیار کیا، ادھر اس نے تلف کردیا (۵)۔ اب جب اس کو نکال دیا تو اب جو کام بھی کیا جائے گا اس میں کامیابی خاطر خواہ ہوگی اور تلف وغیرہ سے اطمینان ہوگا۔ سو ذکر پر کفایت نہ کرو بلکہ اعمال بھی اختیار کرو ورنہ کتنا ہی بڑا ذکر ہو اعمال سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ ذکر کا اثر یعنی رفع خطرات اس کے قلب میں کسی درجہ کا بھی پیدا ہوگیا ہو کیونکہ ذکر تو اعمال کے اچھے ہونے کا ذریعہ ہے باقی مقصود اصلی اعمال ہی ہیں

(۱) بیکار (۲) مایوسی (۳) وساوس دور ہونے کا (۴)۔۔۔ (۵) ہلاک کردیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دشمن کو نکالنے کی ترکیب بتائی ہے اس کے بعد تعمیر وطن کرو اعمال سے۔ دیکھئے توپ بھی بادشاہ کے لیے ضروری چیز ہے اور بدون اس کے سلطنت نہیں ہوسکتی اور اس کا اثر دشمن کو نکال دینا ہے۔

ذکر کے علاوہ اعمال حسنہ کی ضرورت

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ساری عمر توپ ہی داغا کرو آج کل اس مشرب کے لوگ بھی ہیں کہ ذکر و شغل میں مصروف ہوئے اور اسکا کچھ اثر پایا بس ان کو قناعت ہوگئی گویا معراج ہوگئی اور تمام کمالات حاصل ہوگئے اور جو ان سے کہا جائے کہ اور بھی کچھ کرنا چاہیے تو کہتے ہیں ذکر خدا سے بھی کوئی بڑی چیز ہے اور لذکر اللّٰہ اکبر پڑھ دیتے ہیں اور یہ سب خرابی علم دین نہ ہونے کی ہے کہ بات بات میں الجھن ہوتی ہے۔ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ دین کا راستہ صاف ہے مگر صاف راستہ کے لیے یہی تو دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے سڑکیں کیسی ہی چکنی اور صاف ہوں مگر ان سے بھی تو واقفیت کی ضرورت ہے کوئی نئے راستہ پر بلا رہبر کے نہیں چل سکتا بلکہ بسا اوقات دیکھے ہوئے راستہ پر بھی رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ایک حسی سڑک کا یہ حال ہے جو آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے تو اس راستہ کا کیا حال ہوگا جو آنکھ سے دیکھنے کی چیز بھی نہیں۔ کس قدر فاش غلطی ہے ان لوگوں کی جو اپنی رائے اور عقل کو دین کی راہ میں کافی سمجھتے ہیں۔ نتیجہ سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہوتا کہ قدم قدم پر غلطی کرتے ہیں اور منہ کے بل گرتے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ دین میں غلطی کرنے والا کہاں گرتا ہے۔ سڑک پر غلطی کرنے والا تو بہت سے بہت یہ کہ منزل مقصود تک نہ پہنچے گا جو کہ بالذات بھی مقصود نہیں یا کسی کھائی اور گڑھے میں گر جائے گا جو ایک قابل برداشت ہلاکت ہے مگر دین کے راستہ میں غلطی کرنے والا جہاں گرتا ہے اس کا نام جہنم ہے جو ناقابل برداشت ہلاکت ہے اسی رائے کے اتباع سے بڑے بڑے عقلاء نے ذات وصفات کے مسائل میں بڑی بڑی موشگافیاں کیں جن کو لوگوں نے بہت ہی نظر استحسان سے دیکھا اور ان کو بڑا محقق سمجھا مگر جب وحی آئی تو معلوم ہوا کہ تحقیق سے ان کو مس (۱) بھی نہ تھا اور سارے اقوال خیال

(۱) تحقیق سے ان کا دور کا تعلق نہیں

ڈھکو سلے تھے اور بالکل وہ حالت ہوئی جیسے ایک اندھا آدمی ایک ایسی چیز کی نسبت کوئی رائے ٹٹول کر قائم کرے جس کو اس سے پہلے ٹٹول کر کبھی نہ دیکھا ہو پھر ایک دم اس کی آنکھ روشن ہوجائے تو اس وقت وہ لاحول پڑھے گا کہ میں نے کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا۔ اسی طرح آج کل بھی جو لوگ عقل کے مدعی ہیں اور اپنے نزدیک کسی چیز کی نسبت پورے وثوق کے ساتھ رائے قائم کر لیتے ہیں جب اہل حق سے مقابلہ ہوتا ہے تو ذرا دیر میں ان کی تحقیقات لاشی محض (۱) نظر آنے لگتی ہیں۔ آخر حق حق ہے اور باطل باطل۔ ''وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ''(۲) بس اسی واسطے دوسرے کی اتباع کی ضرورت ہے۔ یہ بڑی غلطی ہے کہ آدمی اپنی عقل کو کافی سمجھ لے۔ اس سے چھوٹی سے بڑی تک سب ہی قسم کی غلطیاں ہوسکتی ہیں۔

عقل اور نقل میں مناسبت

اس کا راز یہ ہے کہ عقل ایک قوت مدرکہ کا نام ہے حق تعالیٰ نے یہ قوت انسان کو عطا فرمائی ہے تاکہ وہ بھلے برے میں تمیز کر سکے جیسے اور بھی حواس عطا فرمائے ہیں مگر جس طرح تمام حواس کا احساس محدود ہے (۳) مثلاً آنکھ ایک حاسہ ہے جو ایک سمت کو دیکھ سکتی ہے، ایک آن میں دوست پر نظر کر سکتی ہے اور مسافت بھی اس کے دیکھنے کی محدود ہے۔ علیٰ ہذا سمع (۴) بھی ایک حاسہ ہے اور اس کا احساس گو کسی سمت کے ساتھ خاص نہیں مگر محدود وہ بھی ہے کہ خاص مسافت تک کی آواز مسموع (۵) ہوسکتی ہے اس سے آگے کی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح عقل کے ادراک کی بھی ایک حد ہے جیسے ان حواس کے احساس کی تھی پھر اس کو مطلق العنان اور غیر محدود کیوں سمجھا جاتا ہے کہ اس کے ادراک کے لیے کوئی حد ہی نہیں مانی جاتی بلکہ جس طرح آنکھ آلہ مبصرات (۶) ہے اور ایک حد پر رک جاتی ہے اور اس سے آگے کے لیے ضرورت ہوتی ہے دور بین کی، اور اس اعانت سے آنکھ بہت بڑھ جاتی ہے ایسے ہی عقل کا ادراک بھی ایک حد پر رک جاتا

(۱) ان کی تحقیقات بالکل بیکار معلوم ہوتی ہیں (۲) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیجئے کہ حق (سچا دین) آیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل مٹے'' سورۂ بنی اسرائیل: ۸۱ (۳) یہ حواس ایک حد تک کام دیتے ہیں (۴) سماعت (۵) سنائی دیتی ہے (۶) دیکھنے کا آلہ۔

ہے۔ وہاں ضرورت ہے وحی کی اس کی مدد سے وہ بہت کام دے سکتی ہے اور ہر برے بھلے میں فرق کرسکتی ہے۔ بس وحی کو عقل سے وہی نسبت ہے جو دور بین کو آنکھ سے ہے۔ اور گو اس صورت میں بھی ادراک عقل ہی سے ہوتا ہے مگر وحی کی اعانت سے اور بلا اس کے وہ اپنی ذاتی حد سے آگے ادراک نہیں کرسکتی جیسے دور میں بھی دیکھا آنکھ ہی نے مگر دور بین کی مدد سے اور بلا اس کے وہ بہت دور کی چیز کا احساس نہیں کرسکتی تھی اور اگر بلا دور بین کے دیکھے گی بھی تو ایسی غلطی کرے گی جیسے اندھا آدمی کرتا ہے۔ اسی طرح ان باتوں میں جن میں عقل کافی نہیں ہے اگر عقل محض سے کام لیا جائے گا تو ایسی غلطیاں صادر ہوں گی جیسے بے عقل سے ہوتی ہیں۔ چنانچہ عقلاء کی تحقیقات کو دیکھئے کہ بالکل مجنونانہ ہیں اور وحی سے ان کی غلطی پکڑنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض مجنونانہ بکواس تھیں تو ان امور میں جو وحی سے تعلق رکھتے ہیں عقل محض کو دخل دینا سوائے بددینی اور بدعقلی کے اور کیا ہے۔ اس تقریر سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ احکام نقل عقل سے بالاتر ہیں جیسے دور بین کے مدرکات آنکھ کے مدرکات سے بالاتر ہیں اور جو چیز دور بین ہی سے نظر آسکتی ہے اس میں صرف آنکھ سے کام لینا جائز نہیں بلکہ دور بین سے اس میں اعانت لینی پڑے گی اور اسکا اتباع کرنا پڑے گا۔ اگرچہ بدون دور بین کے آنکھ سے وہ چیز بالکل بھی نظر نہ آتی ہو اس سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ دین کے بارے میں بھی حکم یہی ہوگا کہ اگر دین عقل محض سے بالکل بھی سمجھ میں نہ آتا ہو تب بھی دین کا اتباع چاہیے تھا جیسے مبصرات بعیدہ(۱) میں دور بین کا اتباع کرنا پڑا تھا۔ میری اس تقریر سے عقل ونقل کی باہمی نسبت بخوبی واضح ہوگئی اور اس سے یہ مسئلہ بھی بخوبی حل ہوگیا کہ ہم کو دین کے اتباع کی ہر حال میں ضرورت ہے گو اس کی بعض باتیں ہماری سمجھ میں بھی نہ آئیں۔ اگرچہ واقع میں دین کا راستہ بالکل صاف اور اس میں بعید از عقل کوئی بات نہیں مگر بعض دفعہ عقل کام نہیں دیتی تو اسی طرح محض رائے سے ذکر کو کافی سمجھنا یہ بھی جہل محض ہے ورنہ تعلیم شرائع کی اساس ہی(۲) منہدم ہوئی جاتی ہے۔

(۱) دور کی چیزوں کو دیکھنے کے لیے دور بین کی مدد کی ضرورت ہے (۲) بنیاد ہی گر جاتی ہے۔

صرف ذکر لسانی کافی نہیں

غرض خوب سمجھ لو کہ محض ذکر زبانی کافی نہیں ہے بلکہ اعمال نماز روزہ وغیرہ کی بھی ضرورت ہے۔ دین بدون ان کے کامل نہیں ہوتا ذکر میں شیطان کو بھگانے کی خاصیت بے شک ہے۔

دل اعمال صالحہ سے آباد ہوگا

اور یہ ایسی خاصیت ہے جیسے توپ خانہ میں دشمن کے بھگانے کی مگر توپ خانہ قائم جب ہی رہے گا جبکہ میگزین موجود ہو اور میگزین مہیا کرنے کے لیے ملک کی آبادی ضرورت ہے اگر ملک آباد نہ ہوگا تو میگزین کہاں سے آئے گا اور توپ خانہ کیا کام دے گا ایسے ہی ذکر میں بے شک خاصیت ہے قلب کی حفاظت کی مگر یہ اثر اس میں جب ہی کام دے گا جبکہ ملک قلب آباد بھی ہوا اور قلب کی آبادی اعمال صالحہ سے ہوتی ہے بدون اعمال کے خالی ذکر ایسا ہی معطل (۱) رہے گا جیسے توپخانہ بلا میگزین کے اس تقریر سے ذکر کا اثر بھی بحال رہا۔ صرف یہ بات مزید ہوئی کہ اس کے اثر کے لیے کچھ شرائط ہیں اور وہ اعمال ہیں اس سے اعمال کی ضرورت ثابت ہوئی اور اس مذاق کی غلطی ظاہر ہوگئی کہ مجرد (۲) ذکر کافی ہے اعمال کی حاجت نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کا اثر ابتدائی بیان فرمایا ہے کہ اس سے شیطان ابن آدم کے قلب سے ہٹ جاتا ہے ویسے ہی ذکر کے مقابل یعنی غفلت کا بھی ابتدائی اثر بیان فرمایا ہے اور اس قید ابتدائی کی توضیح بخوبی ہوگئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذکر کا یہ اثر کہ شیطان ہٹ جائے اور غفلت کا یہ اثر کہ شیطان قلب پر مسلط ہوجائے اثر ابتدائی ہے پس اس سے آگے کے آثار اور نتائج کی نفی لازم نہیں آتی۔ سو غفلت کا نتیجہ بھی کوئی صرف یہی نہ سمجھے کہ شیطان قلب پر آجاتا ہے اور بس یہ تو جڑ ہے آگے پھر اس میں پھل پھول پیدا ہوتے ہیں وسوسہ صرف ابتدائی نتیجہ ہوتا ہے غفلت کا پھر کبھی اس وسوسہ سے حدیث النفس کی نوبت آتی ہے۔

وسوسہ کس صورت میں مضر ہوجاتا ہے؟

پھر حدیث النفس سے عزم اور فعل کی نوبت آتی ہے وہ وسوسہ کے مرتبہ میں تو

(۱) بیکار (۲) خالی ذکر کافی ہے۔

مضر نہ تھا مگر اس پر اتنے مرتبے اور متفرع ہو گئے اب وہ وسوسہ مضر ہو گیا یعنی بواسطہ عزم اور فعل کے اور بواسطہ کی قید میں نے اس لیے بڑھادی کہ کوئی یہ نہ کہے کہ وسوسہ کو تو ابھی غیر مضر کہا تھا اور اب مضر کہہ دیا اور یہ تعارض ہے۔ اس قید سے جواب نکل آیا کہ وسوسہ فی نفسہ خود تو مضر نہیں ہاں بواسطہ مضر ہو گیا۔ یعنی وسوسہ غیر مضر اسی وقت تک ہے جب تک کہ وسوسہ رہے اور جب عزم وفعل کے مرتبہ میں آ گیا اب مضر ہے تو وسوسہ کی دو حالتیں ہیں کبھی تو یہ نوبت ہوتی ہے کہ دل میں جم گیا اور عزم وفعل تک پہنچ گیا۔ یہ درجہ مضر ہے اور کبھی اس کا مصداق ہوتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۱) حق تعالیٰ متقین کی شان میں اور ان کی مدح میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب ان کو شیطان کی طرف سے کسی وسوسہ کا اثر ہوتا ہے تو وہ فوراً ہوشیار ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس سے وہ صاحب بصیرت بن جاتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ وسوسہ بعض حالتوں میں مضر نہیں ہوتا یہ وہ صورت ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالا مگر تم نے اس کو قلب سے معاً دفع کر دیا (۲) اور اس دفع سے میری یہ مراد نہیں کہ وسوسہ کے پیچھے پڑ گئے اس کا بالکلیہ استیصال ہو جائے کیونکہ یہ تو وسوسہ والے کو بہت مضر ہوتا ہے (۳) اور جوں جوں وہ دفع کرتا ہے اتنی ہی اس میں زیادتی ہوتی ہے۔

وسوسہ کا علاج

وسوسہ کا علاج تو یہی ہے کہ براہ راست اس کے دفع کی طرف بھی توجہ نہ کی جائے بلکہ مراد دفع سے یہ ہے کہ وساوس سے توجہ کو ہٹا کر ذکر کی طرف پھیر دے اور کام میں لگ جائے اور وسوسہ کی طرف التفات ہی نہ کرے اس درجہ میں وسوسہ سے نقصان نہیں ہوتا یہی مراد ہے تَذَکَّرُوْا سے اس آیت میں اور اسی پر متقین کی مدح کی گئی ہے۔

وسوسہ غفلت کا ابتدائی اثر ہے

پس خوب سمجھ لیجئے کہ وسوسہ غفلت کا ابتدائی اثر ہے اور یہ ضرور نہیں کہ اس

(۱) سورۃ الاعراف ۲۰۱ (۲) فی الفور دور کر دیا (۳) نقصان دہ۔

سے آگے اور کچھ نتیجہ پیدا نہ ہو ممکن ہے کہ اور نتائج برے سے برے پیدا ہو جائیں۔ بنابریں غفلت جو موجب وسوسہ ہے یہ بھی گناہ ہی کی طرح بواسطہ مضر ہو جائے گی کیونکہ وہ مقدمہ ہے ضرر کا اور اندیشہ ہے اس کے نتائج بڑھنے کا ''مقدمة الشئی فی حکمة''(۱) اس کو معمولی بات نہ سمجھا جائے۔

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل(۲)

وسوسہ گناہ کا مقدمہ ہے

چنانچہ ہر گناہ میں اول وسوسہ ہی ہوتا ہے پھر دل میں وہ خیال پکتا ہی جاتا ہے تو وسوسہ کوئی معمولی بات نہ ٹھہری بلکہ مقدمہ ہے گناہ کا ہاں اس پر گرفت نہیں ہے بلکہ جب تک عزم اور فعل میں نہ آجائے مگر وسوسہ کے بعد اس کے فعل میں آجانے کا اندیشہ تو ضرور ہے، تو اس بھروسے پر رہنا کہ اس خیال کو ہم آگے نہ بڑھنے دیں گے خلاف عقل ہے جب نفس چل نکلا اور کئی درجے طے کر گیا تو پھر عین وقت پر نفس کو روکنا سخت مشکل ہے۔ جیسے گھوڑا چل نکلے اور تیزی میں آجائے تو مقام منہی عنہ(۳) سے اس کو ایک فرلانگ پہلے سے روکنا چاہیے ورنہ اگر ایک دم روکو گے تو نہیں رکے گا بلکہ تم ہی گر پڑو گے۔ اسی طرح اگر نفس کو روکنا ہے تو بہت دور پہلے سے روکئے اس بھروسے نہ رہے کہ وسوسہ تو گناہ نہیں اور فعل کی نوبت ہم آنے نہ دیں گے نفس تو وہ چیز ہے کہ بڑے بڑے شاطروں کے قابو میں نہیں آتا کیونکہ گھوڑا تو ایک حیوان ہے جس کو عقل نہیں آپ کے قبضہ میں ہے جہاں چاہیں رک سکتا ہے۔ اپنی طرف سے وہ کوئی عذر رکنے میں نہیں کر سکتا۔ صرف وہ اپنی ایک طبعی بات سے مجبور ہے کہ تیز دوڑتے ہوئے ایک دم رک جانا اور بعض اوقات اس کو دشوار ہوتا ہے۔ نفس کی تو حالت یہ ہے اس کو آپ کے ساتھ دشمنی بھی ہے اور اس کی طبیعت میں مکر بھی ہے وہ کوئی دقیقہ آپ کو نقصان پہنچانے میں اٹھا نہیں رکھتا اور اس کو وہ تدبیریں آتی ہیں کہ بڑے بڑے عقل مند بھی ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ ایسی

(۱) مقدمہ شیئ اسی شیئ کے حکم میں ہوتا ہے (۲) ''چشمہ کے سوت کو ابتدا ہی میں سوت سے بند کر سکتے ہیں لیکن بڑھ جانے پر اگر ہاتھی بھی رکھو گے تو پر نہ ہوگا'' (۳) ممنوع علاقے سے روکنا۔

حالت میں اس کی باگ کو ڈھیلا چھوڑ کر یہ امید رکھنا کہ موقع پر روک لیں گے خام خیالی ہے۔

اسرار شریعت

اس لیے شریعت نے اس کا بہت لحاظ کیا ہے کہ جس عمل سے روکنا ہے اس سے بہت دور پہلے سے روکا ہے، اسرار شریعت میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس قاعدہ سے کس قدر کام لیا گیا ہے۔ دیکھئے شریعت نے نماز عصر اور نماز فجر کے بعد نوافل سے منع کیا۔ اس واسطے کہ اگر اجازت دی جاتی تو ممکن تھا کہ ایسے وقت میں بھی لوگ نماز پڑھنے لگتے جو نماز کا وقت نہیں ہے یعنی عین طلوع اور عین غروب کے وقت۔ اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ممنوعات سے بچانے کے لیے شریعت نے پہلے سے انتظام کیا ہے اور دیکھئے حق تعالیٰ نے زنا کی حرمت اس لفظ سے بیان فرمائی ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی حالانکہ یہ لفظ بھی کافی تھا لا تزنوا ای عنی زنا نہ کرو مگر بطور تاکید اور پیش بندی کے یہ لفظ اختیار کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ اور آدم علیہ السلام کا اکل من الشجرہ سے منع فرمانے کے لیے بھی: لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ اختیار کیا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قریب بھی مت جاؤ اور ایک حدیث تو اس بارے میں صریح موجود ہے: ''مَنْ يَرْتَعْ حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَّقَعَ فِيْهِ''(۱) یعنی ارشاد فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کوئی سرکاری چراگاہ کے آس پاس بکریاں چرائے گا تو ممکن ہے کہ کوئی بکری چراگاہ میں بھی گھس جائے۔ یہ ٹکڑا ہے ایک حدیث کا وہ یہ ہے کہ: اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بين وبينهما مشتبهات فمن اتقى الشبهات فقد استبرء لدينه ومن يرعى حَول الحمى يوشك ان يقع فيه۔ (۲)

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال بین ہے اور حرام بین ہے اور دونوں کے درمیان میں مشتبہات ہیں یعنی وہ اعمال ہیں جن کا حلال وحرام ہونا پوری طرح واضح نہیں ہے ان کی نسبت فرماتے ہیں کہ جو شبہات سے بھی بچا رہے اس نے اپنے دین کو محفوظ کرلیا اور جو کوئی سرکاری چراگاہ کے قریب اپنے

(۱) جمع المسانید: ۲/ ۶۱۴ (۲) فتح الباری: ۴/ ۲۹۰۔

مویشی کو لے جائے گا (یعنی شبہات کا ارتکاب کرے گا جو حرام کی سرحد سے ملی ہوئی ہے) تو عجب نہیں کہ مویشی چراگاہ میں بھی گھس جائیں اور وہ سرکاری مجرم ہوجائے۔

مشتبہات میں پڑنا بھی خطرناک ہے

مطلب یہ ہے کہ مشتبہات میں پڑنا بھی خطرناک ہے اگرچہ ان کو حرام نہیں کہہ سکتے۔ دیکھئے اس حدیث میں اس قاعدہ کی تصریح موجود ہے کہ جس کو گناہ سے بچنا ہو وہ مشابہ گناہ سے بھی بچے۔ اسی اصل پر اس حدیث میں بھی جس کا بیان میں نے شروع کیا ہے حضرت شارع علیہ السلام نے گناہوں سے روکنے کے لیے وسوسہ کا بھی انسداد فرمایا ہے اور گناہوں کے مقدمہ پر بھی متنبہ فرمایا ہے جو کہ غفلت عن ذکر اللہ ہے میری اس تقریر سے بہت سے شبہات نیز ادلہ کے تعارضات رفع ہوجاتے ہیں۔

وسوسہ گناہ نہیں

مثلاً ایک آیت میں ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۔(۱) اس سے ظاہراً متبادر ہوسکتا ہے کہ وسوسہ بھی گناہ ہے حالانکہ حدیث میں صراحتاً موجود ہے "تَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْ اُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا"(۲) یعنی حق تعالیٰ نے میری اُمت کے قلبی وسوسوں کو معاف فرما دیا ہے سو دونوں نصوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن اس تقریر سے یہ تعارض رفع ہوگیا(۳) کیونکہ میں نے بیان کیا ہے کہ وسوسہ گو گناہ نہیں مگر منع اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ کبھی ذریعہ گناہ کا بن جانا ہے اور یہ شریعت کا انتظام ہے کہ منہیات کے ذرائع سے بھی نہی فرمائی ہے(۴)۔ سو حدیث ظاہر حقیقت پر محمول ہے اور آیت میں جو کچھ وسوسہ کی برائی ظاہراً معلوم ہوتی ہے وہ بطور پیش بندی کے ہے اور میں نے ظاہراً اس لیے کہا کہ اگر غور کیا جائے تو واقع میں آیت میں وسوسہ پر وعید ہی نہیں ہے بلکہ صرف اپنے احاطہ علمی کا بیان فرمایا ہے جیسے دوسری آیت میں ہے: اِنَّهٗ عَلِیْمٌ م بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۔(۵) یہاں وسوسہ کی

(۱) "ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو اس کے جی میں خیال آتے ہیں" سورۃ ق:۱۶ (۲) کنزالعمال:۳۴۵۴۰ (۳) دور ہوگیا (۴) ممنوعات کے ذرائع سے بھی روکا ہے (۵) "بے شک وہ دلوں کے حال کو جانتا ہے کہ وہ نہیں جانے گا کہ اس نے کسے پیدا کیا"۔

بھی تخصیص نہیں بلکہ مطلق دل کی باتوں کے جاننے کو اس میں بیان فرماتے ہیں: اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (بیشک وہ دلوں کے حال کو جانتا ہے) آگے اس کی دلیل ہے۔ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (۱) سبحان اللہ قرآن کی کیا بلاغت ہے یعنی یہ بات تو پہلے سے معلوم ہے کہ سب چیزیں پیدا کی ہوئی خدا تعالیٰ کی ہیں اور خلق مسبوق بالعلم ہوتا ہے (۲) تو اپنی پیدا کردہ چیز کا علم دلیل عقلی سے ثابت ہوا اس واسطے بطور انکار اور تعجب کے فرمایا: اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا وہ نہیں جانتا کہ اس نے کس کو پیدا کیا) کیا خدا تعالیٰ اپنی پیدا کی ہوئی چیز کو نہ جانے گا ضرور جانے گا اور دل کی باتیں بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں تو ان کو بھی ضرور جانے گا اس سے ظاہری محسوسات کا علم بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا جس کا اوپر ذکر ہے۔ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ (۳) تو اس سے احاطہ علم کا بیان کرنا منظور ہے نہ یہ کہ جس چیز کے متعلق علم ہو وہ بری اور گناہ ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ تمام ذات الصدور اور قول سر اور قول جہر (۴) سب گناہ ہی ہوں حالانکہ یہ بداہۃً صحیح نہیں تو اسی طرح اس آیت میں سمجھ لیجئے۔ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ۔ (۵) کہ اس میں احاطہ علم کا بیان فرمانا مقصود ہے۔ چنانچہ یہاں بھی پہلے "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ" (۶) موجود ہے تو اس آیت میں ما توسوس پر وعید نہیں اور اس سے پیچھے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ میں تاکید ہے اسی احاطہ علم کی اور توضیح ہے اس دعویٰ کی یعنی ہمارے علم میں کیا شبہ ہوسکتا ہے ہم تو ان کی جان کے رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں تو آیت مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ سے شبہ وسوسہ کے گناہ ہونے کا کیا جائے جیسے نعلم کے اقتران سے متوہم اس بنا پر ہو گیا تھا کہ بعض آیات میں اثبات وعید بھی مفقود ہے۔

غیر اختیاری وسوسوں سے ڈرنا نہ چاہیے

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وساوس کے متعلق بعض اغلاط کا ذکر کر دیا جائے وہ یہ ہے کہ آج کل ایک جماعت ذاکرین کی اس غلطی میں مبتلا ہو گئی ہے کہ غیر اختیاری

(۱) "کیا وہ نہیں جانتا کہ اس نے کس کو پیدا کیا" سورۃ الملک: ۱۴ (۲) کسی چیز کو پیدا کرنے سے پہلے ہی سے اس کا علم ہوتا ہے (۳) "تم اپنی بات آہستہ کرو یا اونچی آواز سے" سورۃ الملک: ۱۳ (۴) ہلکی اور زور کی بات (۵) "اور ہم جانتے ہیں جو کچھ خیالات اس کے جی میں آتے ہیں" (۶) "اور ہم نے انسان کو پیدا کیا"۔

وسوسوں سے بہت ڈرتے ہیں حتی کہ بعض کو جان دینے تک کی نوبت آ گئی ہے اور اس کی وجہ ان کا ذکاء حس (۱) اور خوف خدا ہے اور یہ حالت بھی فی نفسہ کوئی بری نہیں ان کو احساس تو ہے باقی عوام تو ہاتھی کے ہاتھی نگل جائیں اور ان کو احساس نہ ہو اور ذاکرین کی یہ حالت ہوتی ہے کہ مکھی بھی آ بیٹھے تو ناگوار ہوتی ہے اس ہاتھی اور مکھی پر لطیفہ یاد آیا۔

وسوسہ کی مثال

دہلی میں ایک دیہاتی شخص نان بائی کی دکان پر گوشت کا سالن خریدنے گیا، دکاندار نے پیالہ میں گوشت دیا، دیکھا تو اس میں ایک مکھی بھی تھی، دوکاندار سے کہا میاں اس میں تو مکھی ہے تو بیباک دوکاندار کیا کہتا ہے کہ کیا چار پیسہ میں ہاتھی نکلتا، خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ جیسا فرق ہاتھی اور مکھی میں ہے یہی فرق ذاکرین اور عوام کی حالت میں ہے کہ عوام تو ہاتھی کے برابر بھی گناہ کر گزریں تو دل میلا نہ ہو اور ذاکر کے قلب پر مکھی کے برابر گناہ کا وسوسہ بھی آ جائے تو جان کھونے کو تیار ہوتا ہے مگر واقع وسوسہ پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا۔ گو ذاکر کو اس سے نفرت ایسی ہوتی ہے جیسے گوہ (۲) سے مگر جان لینا چاہیے کہ وسوسہ میں صرف گوہ کا سونگھنا ہے گوہ کھانا نہیں ہے، گوہ کھانا عمل میں ہوتا ہے۔ وسوسہ میں صرف گناہ کی بو آتی ہے اور گوہ کی بو آنے سے وہ پیٹ میں نہیں پہنچ جاتا ہاں نفرت کی چیز بدبو بھی ہے۔ راحت کے لیے خواہ اس کا بھی انسداد کر لو مگر انسداد کے اہتمام میں پریشان نہ ہو۔ اگر تمام عمر بھی وسوسہ رہے تب بھی پیٹ میں نہیں جائے گا اور مطلق گناہ نہ ہوگا۔ تاوقتیکہ فعل کے مرتبہ میں نہ آ جائے یہاں ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ حدیث سے تو معلوم ہوا کہ ذکر کرنے سے شیطان قلب پر سے ہٹ جاتا ہے اور وسوسہ نہیں ڈالتا اور مشاہدہ اس کے خلاف ہے کہ ہم ذکر کرتے ہیں اور پھر یہی وسوسہ رہتا ہے تو سمجھ لو کہ حدیث کا مضمون بالکل صحیح ہے اور ذکر سے بیشک وسوسہ جاتا رہتا ہے مگر کس ذکر سے زبان کے ذکر سے یا قلب کے ذکر سے۔ حدیث ''فَاِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ'' کا مرجع حقیقتاً قلب ابن آدم ہے، کیونکہ انسان قلب ہی سے انسان ہے۔ بس قلب سے ذکر

(۱) قوت حاسہ کی زیادتی (۲) پاخانے سے۔

کر کے دیکھو جو وسوسہ پاس بھی رہے اور ہم جو ذکر کر کے ساتھ وسوسہ پاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ذکر ضعیف ہوتا ہے اس میں قلب اچھی طرح ذاکر نہیں ہوتا کیونکہ یکسوئی نہیں ہوتی بس زبان ہی ذاکر ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے ذکر کا اثر بھی ضعیف ہی ہوگا ورنہ اگر قلب بھی ذاکر ہو تو پھر وسوسہ کی کیا مجال ہے کہ پاس بھی آئے۔ فلسفی مسئلہ ہے کہ ایک وقت میں دو طرف توجہ نہیں ہوسکتی جب ذکر کی طرف پوری توجہ ہوگی تو وسوسہ کیسے آئے گا۔ لیجئے اب تو عقلاً بھی یہ مسئلہ ثابت ہوگیا۔ پس ذکر کے وقت صورت وسوسہ کی یہی ہوتی ہے کہ ذکر میں پوری مشغولی نہیں ہوتی اور ذکر ضعیف ہوتا ہے۔ اب کوئی کہے کہ ذکر قوی کیسے ہو تو جواب یہ ہے کہ ذکر شروع کرتے ہی یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ قلب میں شیطانی اثر پرانا مرض موجود ہے اس کے جاتے رہنے کے بعد بھی قوت کچھ دنوں بعد ہی آئے گی۔ دیکھئے کوئی جسمانی بیماری ہوتی ہے اور اس کا علاج ہوجاتا ہے تو مرض جاتے رہنے کے بعد بھی مہینہ دو مہینہ میں جان آتی ہے، صحت ہوئی دوا سے اور جان آئے گی حلوے سے اور رفتہ رفتہ قوت بڑھے گی اس میں جلدی کرنا نہ چاہیے، مریض کو دوا کرنے کے بعد کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ آج ہی صحت کیوں نہ ہوگئی اور آج ہی طاقت کیوں نہ آگئی۔

رسوخ ذکر کی تدبیر

بس تقویت ذکر کی تدبیر یہی ہے کہ کئے جاؤ اور اس کے لیے کوئی میعاد نہیں یہ تو ساری عمر کا دھندا ہے۔

تادم آخر دمے آخر بود کہ عنایت باتو صاحب سر بود(۱)

اور اگر فرضاً کامیابی نہ بھی معلوم ہو تو اس آیت پر نظر رکھو ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ''(۲) اور سمجھ لو کہ وساوس کا دفع ہوجانا تمہارے ذمہ سعی کرنا تمہارے ذمہ یہی ہے اگر وساوس دفع بھی نہ ہوں تو تمہارے کرنے کا جو کام تھا وہ تم نے

(۱) ''آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری رفیق بن جائے گی'' (۲) ''اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی قوت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا''۔

کرلیا کہ اپنی قوت صرف کی بس اب گناہ نہیں رہا آپ کا کام ارادہ تھا وہ کرچکے یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ان کے یہاں ارادہ دوا بھی نفع مقصود میں مؤثر ہے اور وہ نفع مقصود اجر وقرب ہے(۱)۔ دنیا میں تو یہ ہے کہ مریض کو بلا استعمال دوا نفع نہیں ہوتا(۲) اگر کوئی شخص دوا کے استعمال کا ارادہ ساری عمر بھی رکھے اور اس کے استعمال کی نوبت نہ آئے تو محض بے سود ہے(۳) اور وہاں صرف ارادہ پر بھی اثر مرتب فرمادیتے ہیں۔

مشقت اور مجاہدہ سے ثواب بڑھ جاتا ہے

بس اگر ذکر کے بعد بھی وساوس باقی رہیں تو ثواب وہی ہوگا جو ذکر بلاوسوسہ(۴) میں ہوتا۔ راز یہ ہے کہ اصل ثواب رضا اور قرب کے قصد(۵) سے ہوتا ہے اور دفع وساوس سے بھی رضا وقرب(۶) ہی کا قصد ہوتا ہے سو یہ فعل اب بھی پایا ہی گیا۔ لہٰذا ثواب بھی حاصل ہوگا بلکہ یہاں ایک بشارت اور ہے کہ جو شخص باوجود ہجوم وساوس(۷) کے ذکر کرتا ہے وہ مجاہدہ اور پریشانی کا ثواب اور زیادہ پائے گا اور اس بات میں وہ من وجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بڑھ جائے گا کیونکہ جنید رحمۃ اللہ علیہ اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بلا مجاہدہ ہے اور اس کا ذکر مع المجاہدہ ہے(۸) اور یہ تو بڑی بات مگر میں اپنی طرف سے نہیں کہتا ہوں بلکہ حدیث میں یہ مضمون موجود ہے صحیح حدیث میں ہے کہ جو شخص فتنہ کے وقت دین پر عمل کرے گا اس کو پچاس آدمیوں کا ثواب ملے گا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے پچاس کا یا ان میں سے پچاس کا حضور کا جواب سننے کے قابل ہے فرماتے ہیں کہ تم میں سے پچاس کا اس سے معلوم ہوا کہ زمانہ فساد میں عمل بالدین کا ثواب پچاس حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ المرتضیٰ کا ملتا ہے اور اس میں راز یہی ہے کہ فساد کے وقت دین پر عمل کرنا بہت دشوار ہے(۹)۔ اس مجاہدہ کی وجہ سے ثواب اتنا بڑھ گیا معلوم ہوا کہ مشقت اور مجاہدہ سے ثواب بڑھ جاتا ہے تو جو شخص ہجوم وساوس(۱۰)

(۱) مقصود وثواب اور اللہ کا قرب ہے (۲) دوا استعمال کیے بغیر فائدہ نہیں ہوتا (۳) بالکل بیکار ہے (۴) بغیر وسوسہ کے ذکر میں ہوتا (۵) ارادہ (۶) خدا کی رضامندی اور قرب ہی کا ارادہ ہوتا ہے (۷) کثرت وساوس (۸) ان کا ذکر بغیر مجاہدہ تھا اس کا مجاہدے کے ساتھ ہے (۹) مشکل (۱۰) وسوسوں کی کثرت کے باوجود۔

کے ساتھ بھی ذکر میں لگا رہے اس حدیث کے مطابق اس کا ثواب ذکر بلاوسوسہ کے برابر بلکہ من وجہ زیادہ ہوگا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کیا شفقت تھی کہ سوال کر کے ہم لوگوں کے لیے کیسی بشارت چھوڑ گئے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عجیب شان

واللہ عجب ہی سوال ہے اس حدیث سے یہ نہ سمجھ جانا کہ تم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مرتبہ میں بڑھ گئے کیونکہ مرتبہ میں بڑھ جانا کبھی عمل کی وجہ سے ہوتا ہے کہ ایک شخص کے عمل اور ان کے ثواب دوسرے سے بڑھے ہوئے ہیں اور کبھی مرتبہ کا بڑھ جانا محض فضل سے بھی ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بیوی سے محبت کبھی تو زیور کی وجہ سے ہوتی ہے کہ زیور بہت سے پہنے ہوئے ہر وقت بنی ٹھنی رہتی ہے جس سے خواہ مخواہ اس کی طرف میلان ہوتا ہے اور کبھی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کی صورت خداداد ہی ایسی ہے کہ محبوب ہے، چاہے اس کے بدن پر زیور بالکل بھی نہ ہو تو وہ عورت جس کے زیور زیادہ ہیں یہ نہیں کہہ سکتی کہ بس میں ہی محبوب ہوسکتی ہوں اور وہ عورت مجھ سے زیادہ محبوب نہیں ہوسکتی جس کے پاس زیور زیادہ نہیں ہیں۔ ارے اس کو تو خدا نے کچھ ایسی چیز عطا فرمائی ہے جس کے سامنے تیرے زیور کی کچھ بھی حقیقت نہیں زیور تو ایک عارضی چیز ہے جس وقت اتر گیا کچھ بھی نہ رہا اور حسن خداداد ایسی چیز ہے کہ اسے اتارنا بھی چاہیں تو اتر نہیں سکتا۔ اس طرح حضرات صحابہ کو زیادت قرب کا ایک وہ ذریعہ میسر ہے جو کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا اور وہ فضل خداوندی ہے اور اس کے لیے کوئی قاعدہ نہیں وہ اعمال پر متفرع(۱) نہیں ورنہ اگر یہ کہا جائے کہ درجات کے بڑھنے کی بنا محض اعمال ہی ہیں تو چاہیے کہ نبوت جو سب سے بڑا درجہ کمال کا ہے وہ بھی عمل سے حاصل ہوسکے حالانکہ وہ محض حق تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے کفار کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ہم احکام خداوندی کو جب مان سکتے ہیں کہ ہم پر بھی وحی آئے۔ یوں فرمایا: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (۲) یعنی خدا ہی کو خوب معلوم ہے کہ رسالت کہاں چاہیے۔ یعنی ہم مختار مطلق ہیں جس پر چاہا وحی اتار دی کسی کو اس میں دخل دینے

(۱) اعمال کی وجہ سے نہیں ملتا (۲) سورۃ الانعام: ۱۲۴۔

کا مجاز نہیں اور اس کے واسطے کوئی علت اور وجہ بجز ہمارے ارادے کے نہیں ہوسکتی جس کو ہم نے چاہا فضیلت دے دی۔ معلوم ہوا کہ حصول درجات وترقی مراتب کا مدار صرف اعمال پر نہیں اور اگر تسلیم کرلیا جائے تو ہم پوچھیں گے کہ عمل کہاں سے آیا اس کی اصل اخیر میں جا کر ارادہ نکلے گی اور ارادہ منجانب اللہ ہے تو بعد قطع وسائط (۱) نتیجہ بھی یہی نکلے گا کہ ترقی درجات منجاب اللہ ہے سو جو بواسطہ عطا فرماتے ہیں کیا وہ بلاواسطہ عطا نہیں فرماسکتے۔ غرض آپ کے اعمال پر ثواب مل جانے سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر آپ کی فضیلت یا مساوات ہرگز لازم نہیں آتی۔

فضیلت صحابہؓ کی ایک بلیغ مثال

دیکھئے آدمی مہمان کا تو اعزاز واکرام کیا کرتا ہے اس کی خوب خاطر کرتا ہے، طرح طرح کے کھانے کھلاتا ہے اور اپنے بیٹے اور گھر والے وہی کھاتے ہیں جو گھر میں پکتا ہے۔ تو کیا مہمان کا یہ منہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ میں اس کے بیٹے سے اس کی نظر میں زیادہ عزیز ہوں۔ بیٹے کا عزیز ہونا اور وجہ سے ہے وہ وجہ اس مہمان کو قیامت تک بھی نصیب نہیں ہوسکتی تو اب اگر کسی عمل کے ثواب میں حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بڑھ بھی گئے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان پر آپ کو فضیلت کلیہ حاصل ہوجائے ہاں یہ مسلم ہے کہ اس ایک عمل میں بڑھ گئے جیسے وہ مہمان روٹیوں کی تعداد میں اور کھانے کے انواع واقسام میں بیٹے سے بڑھا ہوا ہے۔

ذکر کے ساتھ وسوسہ مضر نہ ہونے کی مثال

تقریر مذکور سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ وسوسہ کے وقت کا ذکر اجر میں ذکر بلاوسوسہ سے بڑھا ہوا ہے مگر اس سے فضیلت کلی جنید رحمۃ اللہ علیہ اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ پر لازم نہیں آتی اور میں نے جو اوپر وسوسہ کو مضر کہا تھا اور یہاں غیر مضر بتلا رہا ہوں اس سے بھی کوئی تعجب نہ کیجئے یہ حضرت جب ہے کہ وسوسہ اپنی قوت پر ہو اور اگر کوئی چیز اس کے مقابل مثلاً ذکر اس کی قوت کو توڑنے والی موجود ہو تو اس کی مضرت (۲) باقی نہیں رہتی۔

(۱) واسطے منقطع کرنے کے بعد (۲) اس کا نقصان۔

اس کی مثال یہ ہے کہ طباً کوئی دوا مضرت (۱) سے خالی نہیں۔ اطباء کو جہاں دوا کے منافع (۲) معلوم ہوئے ہیں وہاں مضار (۳) بھی ثابت ہوئے ہیں تو علاج میں ممکن ہے کہ کسی کو یہ خیال اور شبہ ہو کہ جب ہر دوا کے کچھ نقصانات بھی ہوں گے تو علاج کیسے ہوا۔ اگر ایک مریض کو فائدہ ہوگا تو دوسرے امراض پیدا ہوجائیں گے۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ گو ہر دوا میں نقصان اور ضرر ہے مگر اس کی اصلاح دوسری دوا سے ہوجاتی ہے اس طرح منافع (۴) دوا کے قائم رہتے ہیں۔ اسی سے نتیجہ یہ نکلا کہ ہر درجہ ضرر کا مضر نہیں (۵)۔ مضروہ ہے جو بلا اصلاح ہو اور جب مصلح بھی ساتھ ہو تو ضرر نہیں رہتا۔ علیٰ ہذا وسوسہ کے بھی دو درجے ہیں ایک بلا ذکر اور ایک مع الذکر (۶)۔ سو وسوسہ بلا ذکر ایک درجہ میں مضر ہے اور مع الذکر مضر نہیں۔ ذکر سے اس کی اصلاح ہوگئی بلکہ بعض اوقات اصلاح کے بعد بالعکس مفید ہوجاتا ہے۔ دیکھئے اطباء سنکھیا (۷) اور جمال گوٹہ (۸) سے بھی علاج کرتے ہیں اس طرح کہ پہلے اس کو مدبر (۹) کرلیتے ہیں اس سے ان کا ضرر جاتا رہتا ہے اور نافع ہوجاتا ہے۔

وسوسہ بعض دفعہ نافع ہوجاتا ہے

اسی طرح وسوسہ بھی ذکر کے ساتھ مدبر ہوکر بعض اوقات نافع ہوجاتا ہے جیسے اوپر بیان ہوا کہ مجاہدہ کے سبب نافع ہوگیا جیسے سنکھیا اور جمال گوٹہ اصلاح کے بعد نفع ہی کرتا ہے۔ جب وسوسہ بھی ذاکر کے لیے اس طرح مفید ہوگیا پھر پریشانی کیوں ہو، کشاکشی کا اجر (۱۰) تو وسوسہ ہی کے بدولت ملا ہے انسان کا کمال اسی سے ہے کہ باوجود دواعی بعد کے پھر قرب (۱۱) کی طرف آئے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اور ان کی ذریت کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار آپ نے ان کو اس حالت میں پیدا کیا ہے کہ یہ کھائیں گے پئیں گے نکاح کریں گے سواری پر چلیں گے (یعنی خوب چین آرام کریں گے بخلاف

(۱) کوئی دوا ایسی نہیں جس کا کچھ نقصان نہ ہو (۲) فائدے (۳) نقصانات (۴) فوائد (۵) نقصان کا ہر درجہ نقصان دہ نہیں (۶) ایک بغیر ذکر ایک ذکر کے ساتھ (۷) زہر (۸) دست آور دوا (۹) پہلے اس کا زہریلا اثر ختم کردیتے ہیں (۱۰) کھینچا تانی کا ثواب (۱۱) دوری کے تقاضوں کے باوجود قرب کی طرف آئے۔

ہمارے کہ ہم ہر وقت عبارت میں مشغول ہیں) اس لیے آپ ان کے لیے دنیا کریں اور ہمارے لیے آخرت۔ حق تعالیٰ نے جواب ارشاد فرمایا کہ میں نے جس کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی (یعنی آدمی) اس کو ایسی مخلوق کے برابر نہ کروں گا جس کو میں نے کن کہہ کر پیدا کر دیا (یعنی فرشتہ، مطلب یہ کہ آدمی کو فضیلت میں زیادہ رکھوں گا پھر یہ تقسیم کیسے ہوسکتی ہے) سو صاحبو! آخر یہ شرف انسان کا کس وجہ سے ہے۔

وسوسہ بلا ذکر مذموم ہے

صرف اسی وجہ سے کہ اس پر منازعت اور کشاکشی مسلط ہے(۱) اور باوجود اس کے پھر وہ عبادت کرتا ہے تو وسوسہ فی نفسہ مذموم نہ ہوا(۲) بشرطیکہ مع الذکر ہو اور حدیث میں وسوسہ مذمومہ سے وہ مراد ہے جو بلا ذکر ہو جس کا قرینہ لفظ غفل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ''اِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ''(۳) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم وسوسہ بلا ذکر سے بچا رہے ہیں۔ ذاکرین اس تقریر کو خوب سمجھ لیں۔

عبادت میں دھیان کی ضرورت

بہرحال حدیث میں ذکر اور غفلت کی خاصیت بیان فرمائی ہے جس سے اس مضمون کی ضرورت معلوم ہوگئی اور یہ مضمون جس درجہ فی نفسہ نافع ہے وہ تو معلوم ہو چکا ہے اب اس عارض کی وجہ سے بھی جس قدر ضروری ہے اس کو عرض کرتا ہوں اور وہ عارض یہ ہے کہ اس کا کسی کو اہتمام نہیں ہے نہ نافع کے اختیار کرنے کا نہ مضر سے بچنے کا(۴)۔ ان دونوں باتوں کو اس قدر خفیف(۵) سمجھ رکھا ہے کہ گویا ذکر کا نفع کوئی معتد بہ(۶) نفع ہی نہیں اور غفلت کا نقصان بھی گویا قابل التفات نہیں۔ چنانچہ ذکر اللہ کو بالکل ہی چھوڑ دیا کوئی اگر دین کا نام لیتا بھی ہے تو روزہ نماز تو کچھ کر بھی لیتے ہیں مگر ذکر کا اہتمام مطلقاً نہیں اور گویا اس کو عبادت ہی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کا کوئی وقت

(۱) اس پر نفس وشیطان کی مخالفت اور کھینچا تانی بروقت ہے (۲) اپنی ذات کے اعتبار سے برا نہیں بشرطیکہ ذکر کے ساتھ ہو (۳) ''جب وہ دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہوتا ہے تو وسوسہ ڈالتا ہے'' تفسیر القرطبی: ۲۰/ ۲۶۲ (۴) نہ فائدہ مند کو اختیار کرنے کا نہ نقصان سے بچنے کا (۵) ہلکا (۶) قابل اعتبار۔

خالص ذکر کے لیے ہو۔ یوں ہر عبادت بھی ذکر ہے مگر یہاں حدیث میں جو ذکر کو غفلت کے مقابل لایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کی وہ فرد مراد ہے جو غفلت کی ضد ہو۔ غفلت کے معنی ہیں بھول جانا۔ یعنی دھیان سے کسی چیز کو اتار دینا تو ذکر کے معنی ہوں گے کسی چیز کی طرف دھیان لگانا سو ہماری عبادات میں یہ نہیں پایا جاتا کہ ہمارا دھیان حق تعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہو بلکہ صرف ایک رسم اور عادت ہے کہ وہ گویا بلا قصد وبلا اختیار ہم سے سرزد ہو رہی ہے ذکر کا مفہوم اس میں بہت ہی کم ہے مگر شاید اس تقریر سے ابھی ذکر کا حقیقی مفہوم سمجھ میں نہ آیا ہو لہٰذا میں اس مضمون کو ذہن سے بہت قریب کرتا ہوں۔ سمجھ لیجئے کہ ذکر لفظ عربی ہے گو اردو میں بھی مستعمل ہے مگر عربی عبارت میں جب آئے گا تو اس کے معنی وہی لیے جائیں گے جو عربی لغت میں ہوں اور یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ہر لفظ باستثناء کسی خاص ضرورت کے معنی حقیقی ہی پر محمول ہوتا ہے تو یہاں بھی اس معنی پر محمول ہوگا۔ گو اردو میں ذکر کے معنی اور ہیں اور دونوں معنی اگرچہ قریب ہیں تاہم فرق ہے، اردو میں ذکر کے معنی زبان سے کسی کی نسبت کچھ کہنا ہے ہمارے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی تمہارا ذکر کر رہے تھے یا فلاں مجلس میں آپ کا ذکر تھا یا پوچھتے ہیں کہ فلاں جگہ میرا بھی کوئی ذکر کرتا تھا اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ میری نسبت بھی کسی نے کچھ کہا تھا اور عربی میں ذکر کے معنی ہیں یاد، جس کا مقابل نسیان ہے۔ نسیان کے معنی بھول جانا اور ذکر کے معنی یاد رکھنا۔ پس ذکر جس معنی میں اردو میں آتا تھا عربی میں اس معنی میں نہیں آتا الا مجازاً لغت کی کتابیں موجود ہیں۔ دیکھ لیجئے اور لغت نہ دیکھو تو حدیث ہی میں دیکھ لو کہ ذکر غفلت کا مقابل ہے اور غفلت کا مفہوم مقابل یاد سے، تو ذکر کے معنی یاد کے ہوئے غرض لغت سے بھی اور حدیث سے بھی ذکر کے یہ معنی ہوئے۔ گو اردو والوں نے عربی کا لفظ لے کر معنوں میں کچھ فرق کر لیا ہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ ذکر اللہ اردو کا لفظ تھا اور میں نے اردو کے لفظ کو اینچ پینچ کر کے (۱) عربی بنا دیا ہے اور اپنے من مانے معنی گھڑ لیے ہیں کیونکہ آج کل یہ بھی ایک نئی ایجاد ہوئی کہ جس لفظ کو عربی بنانا ہو اس کی کچھ صورت بدل دی جیسے سڑک کی جمع کسی نے بنائی تھی اسٹراک یا بعض یہ

(۱) چکر کر کے۔

کرتے ہیں کہ الف لام لگادیا اور اس کو عربی بنالیا۔ مولانا شیخ محمد صاحب کے ایک عزیز تھے کہا کرتے تھے کہ میں مولانا کا ہر بات میں مقابلہ کرسکتا ہوں مگر اس میں عاجز ہوں کہ وہ جس لفظ کو چاہیں ترکیب سے عربی بنالیں تو میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے ''ال'' اور ''بل'' کچھ نہیں لگایا بلکہ اس کا عربی ہی ہونا بحوالہ لغت بیان کردیا پھر آپ کی سمجھ کے موافق تائیداً یہ بھی بتلادیا کہ حدیث ہی میں غفلت کے مقابلہ سے اس معنی (یاد) کا ثبوت موجود ہے جب ثابت ہوگیا کہ اصل مامور بہ(۱) وہ چیز ہے جس کو اردو والے یاد کہتے ہیں تو اب محاورات سے یاد کی حقیقت سمجھو کہ وہ قلب کا فعل ہے یا زبان کا پھر دیکھو کہ حق تعالیٰ کو تم اس طرح یاد کرتے ہو یا نہیں وہ محاورات سنو آپ کی بیوی غسل کو گئی اور زیور کا صندوقچہ تمہارے پاس چھوڑ گئی تو قالاً یا حالاً اس کا مطلب یہ ہے کہ میں دوسرے کام میں لگتی ہوں تم اس کی حفاظت رکھنا تو اگر تم کو اس کا خیال رہا اور اس کی طرف توجہ رکھی اور دیکھتے رہے کہ بندر یا کوا یا کوئی چور اٹھائی گیر(۲) اس کو نہ لے جائے تو اس وقت تو کہہ سکتے ہیں کہ یاد ہے۔ گو زبان سے کچھ بھی نہیں کہا ورنہ تم کہہ سکتے ہو کہ میں اس سے غافل رہا۔

ذکر کی حقیقت

بس یہ یاد عربی میں ذکر کی حقیقت ہے اور یہی یاد بی بی کا مطلب تھا نہ یہ کہ بیٹھے زبان سے زیور زیور رٹے جاؤ حتی کہ اگر ایسا کیا ہو کہ زبان سے تو برابر زیور کرتے رہے لیکن پشت پھیر کر بیٹھ گئے اور زیور کوئی اٹھا کر لے گیا تو اس وقت کسی کے سامنے یہ عذر قابل سماعت نہ ہوگا کہ میں تو برابر زیور کو یاد کرتا رہا خدا جانے کیسے جاتا رہا ہر شخص آپ کو بیوقوف بتائے گا۔ ضرور یہی کہے گا کہ تم نے غفلت کی، حالانکہ زبانی ذکر موجود ہے مگر وہ یاد نہیں سمجھا جاتا۔ بس معلوم ہوا کہ یاد فعل قلب کا ہے خواہ اس کی صورت لساناً بھی متحقق ہو یا نہ ہو اس تحقیق کے بعد اب یہ دیکھ لو کہ ایسی یاد جو عربی میں حقیقت ہے ذکر کی آپ کو کہاں تک حاصل ہے آپ عبادات کو ذکر کہتے ہیں مگر نہ آپ کی نماز میں یہ معنی

(۱) اصلاً جس چیز کا حکم ہے (۲) جیب کترا۔

یاد کے موجود ہیں نہ روزہ میں بلکہ آپ کی زبان میں خاص جس کا نام ذکر ہے یعنی زبان سے اللہ اللہ کرنا اس میں یہ مفہوم ذکر بمعنی یاد کا موجود نہیں، زبان سے اللہ اللہ کا وظیفہ رٹ رہے ہیں اور دل کو خبر بھی نہیں حالت یہ ہے:

سبحہ برکف توبہ برلب دل پراز ذوق گناہ معصیت را خندہ می آید براستغفار ما(۱)

آج کل کی عبادت اور ذکر محض ایک رسم ہے

جب ہماری عبادت کی حالت یہ ہے تو اس کو ذکر کہنا جس کی حقیقت ابھی معلوم ہوئی کیا معنی ہم لوگ تو ذکر کے پاس بھی نہیں ہیں ذکر کی طرف سے ہر طبقہ کو بفرق مراتب غفلت ہے(۲) کیونکہ تم خدا کو اتنا بھی تو یاد نہیں کرتے جتنا بی بی کو اور اپنے ایک معمولی دوست کو یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہد ہے کہ جس کو دھیان رکھنا کہتے ہیں وہ لوگوں میں بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ بس عابدین میں عبادت صرف ایک رسم رہ گئی ہے اسی طرح اور ذاکرین میں ذکر ایک رسم رہ گئی ہے جس کو سب ادا کر رہے ہیں باقی جو معنی تھے ذکر کے اس کا وجود تو شاید ہی کہیں ہو تو یہ کہنا بالکل صحیح ہوا کہ ذکر کا اہتمام مسلمانوں میں نہیں ہے جب ذکر معدوم ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ضد موجود ہوگی یعنی غفلت اور اس کے دفع کا بھی اہتمام نہیں ہے تو میرا کہنا صحیح ہوگیا کہ جن دو چیزوں کا حدیث میں ذکر ہے ان دونوں کی طرف سے غفلت ہے پھر تماشا یہ کہ ذکر سے بھی غفلت ہے اور اپنی غفلت سے بھی غفلت ہے ان عوارض سے بھی ان کا بیان نہایت ضروری ٹھہرا یہ تفصیل ہوئی ضرورت کی۔

ذکر اللہ کا اثر

اب حدیث کا بیان ہوا ہے ''اِذَا ذُکِرَ اللّٰہَ''(۳) خنس اور ذکر کے معنی ہوا کہ جب خدا کی طرف دھیان ہوتا ہے تو شیطان ہٹ جاتا ہے اس پر کوئی عقلی اشکال نہیں ہوسکتا کیونکہ ایک وقت میں دو طرف دھیان کا نہ ہوسکنا عقلاً مسلّم ہے پس یاد خدا سے قطع

(۱) ''تسبیح ہاتھ میں اور لب پر توبہ اور دل گناہوں سے بھرا ہوا، ہمارے استغفار پر گناہ کو ہنسی آتی ہے''
(۳) ذکر کے بارے میں ہر شخص فرق مراتب کے ساتھ غفلت کا شکار ہے (۳) ''جب اللہ کا ذکر کیا'' تفسیر القرطبی: ۲۰/۲۶۲۔

وسوسہ ضروری امر ہے البتہ ذکر کے اس معنی پر عقلاً دو شبہے ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ جب ذکر سے مراد قلبی ہوا تو اگر کوئی شخص نماز میں قرأت وتشہد وغیرہ کو دل میں سوچ لے اور زبان سے کچھ نہ پڑھے تو چاہئے نماز ہوجائے کیونکہ ذکر قلبی تو پایا گیا اور یہی مقصود تھا۔ اسی طرح سے چاہئیے کہ اگر کوئی قرأت وغیرہ زبان سے پڑھے اور دل میں خیال نہ ہو تو اس کی نماز نہ ہو۔ تو کیا اس میں فتویٰ شریعت کا یہی ہے اس کا جواب وہی ہے جو پہلے عرض کیا گیا کہ بعض باتیں ایسی ہیں جو وحی ہی سے معلوم ہوتی ہے اور وحی سے معلوم ہوگیا کہ اول شخص کی نماز نہ ہوگی اور دوسرے شخص کی ہوجائے گی ہم کو اس میں عقل دوڑانے کا کوئی حق نہیں ہے اس کی مثال محسوسات میں یہ ہے کہ اطباء نے دوا کے اثر کے لیے کچھ قواعد عقلیہ لکھے ہیں اور وہ قواعد صحیح ہیں۔ مثلاً ادویہ حاریہ امراض باردہ کو نافع ہیں (۱) بوجہ حرارت کے، اس طرح بالعکس یہ سب قواعد ہیں مگر بعض دوائیں ایسی بھی ہیں کہ ان کا اثر ان قواعد کے خلاف پایا جاتا ہے اس کو اطباء مؤثر بالخاصہ کہتے ہیں وہ دوائیں حرارت اور برودت سے مؤثر نہیں ہوتیں بلکہ ان کا اثر صرف تجربہ سے معلوم ہوا ہے گویا نقل پر موقوف ہے اور عقل سے آج تک اس کی وجہ نہیں دریافت ہوسکی۔ دیکھئے کہربا تعلیقاً (۲) اختلاج قلب کو مفید ہے جس کی ظاہر میں کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

بعض احکام کی علت معلوم نہیں

ایسے ہی اگر بعض اعمال کے خواص اور احکام وحی سے ایسے معلوم ہوں جو قواعد ظاہرہ کے خلاف ہوں اور عقل میں نہ آسکیں تو کیا استعجاب ہے۔ پس یوں کہا جائے گا کہ حدیث میں تو آیا ہے کہ ذکر کا اثر شیطان کا ہٹ جانا ہے اور غفلت کا اثر وسوسہ ہے یہ آثار بالکیفیت ہیں اور علاج بالضد کی قبیل سے ہیں اور قرأت بلا توجہ قلب سے نماز کا صحیح ہوجانا اور صرف قلبی قرأت سے نماز کا صحیح نہ ہونا یہ اثر بالخاصہ ہے اور کسی کو اس میں حق مزاحمت کا نہیں جیسے اگر طبیب کہے کہ کہربا تعلیقاً مفیدًا خلاف ہے تو کوئی مزاحمت نہیں کرسکتا۔

(۱) گرم دوائیں ٹھنڈے امراض کے لیے مفید ہیں گرمی کی وجہ سے (۲)۔۔۔۔۔۔۔۔

ذکر لسانی مع توجہ قلب کے افضل ہے

علی الاطلاق یہ اعتقاد یا دعوے کہ ذکر قلبی تمام احکام میں ذکر لسانی سے زیادہ کافی ہے الحاد ہے بلکہ حق یہ ہے کہ جہاں شریعت نے ذکر لسانی کو کافی کہا ہے وہاں وہ کافی ہے اور جہاں ذکر قلبی کو کافی کہا ہے وہاں وہ کافی ہے۔ ایک شبہ تو یہ تھا دوسرا شبہ جو مشائخ کے طرز عمل سے ناشی ہوتا ہے اس کو بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعضے مشائخ ذکر قلبی کی تعلیم کرتے ہیں اور یوں بتاتے ہیں کہ زبان تالو سے لگا کر ذکر کرو جس میں حرکت زبان کا احتمال ہی نہ رہے۔ اس طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قلبی ذکر لسانی سے افضل ہے بلکہ ذکر قلبی ہی ذکر ہے اور ذکر لسانی کسی شمار ہی میں نہیں ہے اور بعض محققین بجائے اس کے ذکر لسانی کی تعلیم کرتے ہیں حتی کہ پاس انفاس میں بھی یہی تعلیم کرتے ہیں کہ زبان ہی سے کرو سو مشائخ کے اس مختلف طرز عمل سے تعارض کا شبہ ہوتا ہے جواب یہ ہے کہ اگلے مشائخ بے شک ذکر قلبی کی تعلیم کرتے تھے اور وہ مفید بھی زیادہ ہے۔ خصوصاً ابتداء میں لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ محض ذکر قلبی شروع کرنے کے وقت تو ذکر ہوتا ہے مگر چونکہ اس کی کوئی محسوس صورت نہیں اس واسطے ذرا دیر کے بعد قلبی توجہ زائل ہوجاتی ہے اور خیال کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے پھر نہ ذکر لسانی رہتا ہے نہ قلبی اور ذاکر اسی دھوکہ میں رہتا ہے کہ میں ذکر قلبی میں مشغول ہوں اور ذکر کا وہاں پتہ بھی نہیں رہا، تو یہ وقت سارا یوں ہی ضائع ہوجاتا ہے اس واسطے آج کل ذکر لسانی کی تعلیم زیادہ معمول ہے مگر مع توجہ قلب تاکہ اگر ذکر قلبی نہ بھی رہے تو لسانی تو باقی رہے نیز ذکر لسانی مذکر رہتا ہے ذکر قلبی کے لیے اور بوجہ مذکر ہونے کے اس میں توجہ قلب کی بالکلیہ زائل نہیں ہونے پاتی تو ذکر لسانی میں دو فائدے ہوئے ذکر قلبی بھی اس کے ذریعے کچھ نہ کچھ باقی رہتا ہے اور خود لسانی تو ہے ہی اور یہ خرابی مذکور محض ذکر قلبی میں اس صورت میں ہے جبکہ آدمی حدیث النفس میں لگ جائے چنانچہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ زبان کو بند کر کے جب ذکر قلبی شروع کیا تو نفس طرح طرح کے خیالات میں الجھا دیتا ہے بس ذکر گیا گزرا ہوا اور کبھی اس ذکر قلبی سے بیہوشی کی سی حالت طاری ہوجاتی ہے اس صورت

میں بھی ذکر باقی نہیں رہتا، لوگ اس کو استغراق سمجھتے ہیں حالانکہ یہ استغراق نہیں صرف بیہوشی ہے۔

استغراق کی حقیقت

استغراق یہ ہے کہ خلق سے غفلت ہو اور حق تعالیٰ کی طرف توجہ ہو اور اس حالت میں دونوں طرف سے بے خبر ہوجاتا ہے اور گو یہ مضر نہیں اور نہ غفلت میں داخل ہے کیونکہ اہتمام ذکر کے بعد ہوا ہے مگر اس میں اجر بھی نہیں ہے کیونکہ اجر قصد پر ہوتا ہے اور بیہوشی میں قصد باقی نہیں رہتا جیسے سونے میں اجر نہیں اور یہ بیہوشی نوم تو نہیں ہے مگر مشابہ نوم ضرور ہے اور بوجہ اشتراک علت کے حکم دونوں کا ایک ہی ہے جس کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ اس بیہوشی سے بھی ان حالات میں وضو جاتا رہتا ہے جن حالات میں نوم سے جاتا رہتا ہے بعض ذاکرین اس سے بے خبر ہیں غرض بیہوشی میں ذکر باقی نہیں رہتا بس یہ دھوکہ ہوجاتا ہے ذکر قلبی میں۔

ذکر لسانی کی عجیب مثال

اس واسطے بعض محققین کے یہاں آج کل اس کی تعلیم نہیں ہے اور صرف زبانی ذکر بتلایا جاتا ہے اور اسکے ساتھ توجہ قلبی کو جمع کرادیا جاتا ہے جس سے وہ نور علی نور ہوجاتا ہے اور اگر اس حالت میں قلبی ذہول ہوکر صرف زبانی ہی ذکر رہ جائے تو اس مذکورہ دھوکہ سے تو اچھا ہے کیونکہ اگر اصل نہ رہا تو قائم مقام تو موجود ہے۔ موتی مقوی قلب ہے(۱) لیکن اگر وہ میسر نہ ہو تو سیپ ہی کو استعمال کیوں نہ کیا جائے وہ بھی کام دے جاتا ہے۔ خمیرہ تو بن ہی جائے گا اور کچھ نہ کچھ کام تو دے ہی گا اور دنیوی اسباب میں تو عادت سبب ناقص پر سبب کامل مرتب نہیں ہوگا مگر اسباب آخرت میں ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے تو اگر یہ ذکر جو محض لسانی ہے ناقص بھی ہو تب بھی ہم کو اجر کامل کی توقع کی گنجائش ہے اور ایک ذکر ہی کی، کیا تخصیص ہے تمام اعمال میں دیکھ لیجئے کہ ہمارے ان اعمال پر اجر کیوں مرتب ہوتا ہے وہ اعمال اس قابل ہوتے ہیں کہ ان پر اتنا اجر ملے گا ہرگز نہیں۔ محض فضل

(۱) سچے موتی دل کی تقویت کا باعث ہیں۔

خدا اور عطا ہی کہ اتنا اجر دیا جاتا ہے تو اب میں کہتا ہوں کہ ذکر لسانی ذکر قلبی کا بدل ناقص سہی اس سے گھٹا ہوا سہی مگر اللہ تعالیٰ سے امید رکھنا چاہیے کہ وہ اس پر بھی وہی قرب مرتب فرمادیں گے جو ذکر قلبی پر ہوتا ہے کیونکہ وہاں تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں خود ذکر قلبی پر اجر بھی محض عطا ہی سے تھا ایسے ہی ذکر لسانی پر اگر محض عطا سے ہوجائے تو کیا مستبعد ہے۔

نماز کی نیت زبان سے کرنا مستحب ہے

یہی راز ہے اس کا کہ فقہاء نے زبان سے نیت کرنے کو مستحب کہا ہے گو بعض لوگوں نے اس کو بدعت کہا ہے مگر حقیقت میں بدعت نہیں ہے بلکہ مکمل سنت ہے اور اسکی نظیر بھی شریعت میں موجود ہے کہ احرام باندھتے وقت کہا جاتا ہے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ(۱) یہ مقیس علیہ موجود ہے اور علت مشترک ہے یعنی استحضار قلب وزبان سے نیت کرنا کیوں بدعت ہوگی۔ پس اصل نیت قلبی ہی کو کہا جائے گا باقی نیت لسانی اس کو مقوی اور مکمل ہے(۲) اس لیے اکثر محققین نے زبانی نیت کو ایسے شخص کے لیے جس کے تعلقات زیادہ ہوں اور یکسوئی میسر نہ ہو خصوصیت کے ساتھ افضل کہا ہے۔ صرف اسی وجہ سے کہ اس سے نیت قلبی کا استحضار ہوجاتا ہے۔ جن لوگوں نے زبانی نیت کو افضل کہا ہے ان کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نیت قلبی سے بھی افضل ہے حتی کہ اگر کوئی صرف زبانی نیت پر اکتفا کرے تو نماز صحیح بلکہ افضل ہوگی یہ مطلب نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نیت قلبی کے ساتھ نیت لسانی کو جمع کرلینا افضل ہے کیونکہ ارادہ کو نیت لسانی نے قوی کردیا نہ یہ کہ قلب کی نیت کا وجود ہی نہ ہو اور یہ تجربہ بھی ہے کہ زبان سے نیت کرنے سے خواہ قلب کسی شغل میں ہو حاضر ہوجاتا ہے۔

ذکر بالجہر کی مصلحت اور حکمت

اور اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ صوفیاء نے ذکر بالجہر (۳) کو معمول کیا اور اس کو پسند کیا۔ ظاہراً تو یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ عبادت میں اخفاء ہی اسلم ہوتا ہے(۴)۔

(۱) ''اے اللہ میں حج اور عمرہ کا ارادہ کرتا ہوں'' (۲) تقویت وتکمیل کا باعث ہے (۳) بآواز بلند ذکر کرنا (۴) پوشیدہ رکھنا پسندیدہ ہے۔

ریاء کی صورت بھی نہ پیدا ہو مگر مصلحت اس میں یہی ہے کہ جہر سے قلب متوجہ ہوجاتا ہے اور بلا جہر کے متوجہ ہونا مشکل ہے تو جہر ذریعہ ہوا استحضار قلب کا اور یہاں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جب جہر سے غرض صرف استحضار قلب ہے تو جہر کی حد اسی قدر ہوگی جس سے استحضار ہوجائے نہ یہ کہ اس سے اور پریشانی ہونے لگے اور دماغ کو تعب (۱) ہو اور محلہ والے بھی پریشان ہوں مگر آج کل رسوم کا ایسا غلبہ ہوا ہے کہ ذکر کریں گے تو نہ اس کی غرض سے بحث ہے نہ غایت سے بس غل مچاڈالا (۲)۔ایک ڈپٹی کلکٹر ہیں ان کو ایک شیخ نے تعلیم فرمایا کہ جہر سے ذکر کیا کر۔ اس بندہ خدا نے اتنا جہر کیا کہ سارے محلہ کا سونا مشکل کردیا اور اپنے دماغ میں پیوست (۳) آگئی اور توحش پیدا ہوگیا۔ شیخ صاحب کو لکھا وہاں سے جواب نہ آیا، بیچارے سخت پریشان ہوئے۔ شیخ وہ چاہیئے کہ لطف اس کا ہر حالت میں ساتھ رہے۔ طالب سے اس کو محبت ہو۔

شیخ کامل کی ایک حالت

شیخ کامل کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ میں نے حضرت حاجی صاحب سے سنا ہے کہ یہ لوگ کبھی خفا بھی ہوتے ہیں اور کسی کو اپنے یہاں سے نکالتے بھی ہیں تو محض زبان سے نکالتے ہیں اور قلب سے کھینچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طالب ان کے یہاں سے جاتا نہیں ورنہ اگر قلب سے نکال دیں تو پھر طالب ٹھہر نہیں سکتا۔ حقیقت میں شیخ کامل عجب چیز ہے وہ رحمت الٰہیہ کا نمونہ ہوتا ہے۔ دیکھئے خدا تعالیٰ کے ساتھ بندوں کا برتاؤ کیا ہے اور ان کا برتاؤ بندوں کے ساتھ کیسا ہے کہ کوئی گناہ نہیں جو بندوں سے نہ ہوتا اور پھر بھی کسی پر رزق کا دروازہ بند نہیں کرتے یہی شان شیخ کامل کی ہوتی ہے۔ بقول عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ۔

بندہ پیر خرابا تم کہ لطفش دائم است زانکہ لطف شیخ زاہد گاہ ہست وگاہ نیست (۴)

شیخ کامل تو عاشق ہوتا ہے مرید پر گو اس کے عشق کا ظہور نہیں ہوتا کیونکہ

(۱) دماغ تھکے (۲) شور مچادیا (۳) خشکی (۴) ''میں میکدہ کے مالک کا غلام ہوں کہ اس کی ہمیشہ مہربانی رہتی ہے جبکہ ناقص عقل شیخ اور پاکباز شریعت زاہد خشک کی مہربانی کبھی بھی نہیں رہتی ہے''۔

عشق معشوقاں نہاں است وستیر عشق عاشق باد و صد طبل ونفیر(۱)

ان کا نکالنا ایسا ہوتا ہے جیسے باپ بیٹے پر خفا ہوتا ہے۔ تو کہتا ہے کپڑے اتار دو اور جاؤ نکلو زبان سے تو یہ کہتا ہے اور دل میں یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی خطا پر نادم ہوجائے اور قدموں پر گر پڑے اور معافی چاہ لے کسی طرح اس کی اصلاح ہوجائے اور ایک تار نہ اتارے۔ غرض جب ڈپٹی صاحب کو شیخ صاحب نے جواب نہ دیا تب انہوں نے مجھ سے رجوع کیا میں نے سب سے اول شرط یہ کی کہ شیخ اول کی کبھی بے ادبی نہ کرنا جس سے ان کو بڑا تعجب ہوا کیونکہ رسم زمانہ اس کے خلاف ہے۔

بعض علماء ومشائخ کا باہمی حسد

معقولی علماء اور مشائخ میں یہ مرض خاص طور سے ہے کہ اپنے ہم پیشہ کے نام سے جلتے ہیں۔ معقولی علماء کی تو یہ حالت ہے کہ دوسرے کا نام آیا اور جو منہ میں آیا کہنا شروع کر دیا۔ دوسرے مدرسہ کے طالب علموں کو طرح طرح کی ترکیبوں سے توڑتے ہیں۔ کان پور میں ایک مدرسہ تھا اس میں دستار بندی کا جلسہ ہوا انہوں نے دوسرے مدرسہ کے ایک طالب علم کو جہاں ان کی زیادہ کتابیں ہوتی تھیں دستار بندی کے لیے کھینچا (ساری خرابی چندہ کی ہے ہزاروں آدمیوں کا چندہ مدرسہ میں آتا ہے تو ان کو کارروائی دکھلانا بھی ضروری ہے اور وہ کارروائی یہی ہے کہ فارغ شدہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہو اور اس کو کون دیکھتا ہے کہ جن کی دستار بندی ہوئی ہے ان کو کچھ آ بھی گیا ہے یا نہیں بس یہ فکر رہتی ہے کہ قوم کو گنتی گنا دیں ایسا نہ کریں تو مدرسہ کی نیک نامی کیسے ہو) غرض اس طالب علم کو کھینچا اور چونکہ یہ اندیشہ بھی تھا کہ عین وقت پر دوسرے مدرسہ والے اس کو اپنی طرف لے جائیں اس کے انسداد(۲) کے لیے یہ کیا کہ اس طالب علم کو کسی میلہ سے بلا کر کوٹھری میں بند کر دیا اور وہاں اس کی آسائش کا پورا انتظام کر دیا کوئی تکلیف نہیں ہونے پائی اور صبح کو عین وقت پر نکالا اور دستار بندی کر کے چھوڑ دیا کہ اب جہاں چاہو جاؤ، ہمیں تو ایسی ترکیبیں نہیں آتیں۔

(۱) ''معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور نہاں ہے اور عاشق کا عشق دو سو طبل اور چیخ وپکار کے ساتھ آشکار ہے''
(۲) روک تھام کے لیے۔

تصوف کوئی قرنطینہ نہیں ہے

غرض ڈپٹی صاحب سے میں نے کہا محسن اول وہی ہیں ان کو رنجیدہ کرنا اور ان کے بے ادبی کرنا مناسب نہیں اور میں نے ان کی تعلیم میں کچھ ترمیم کردی۔ انہوں نے پنشن لے لی تھی اور ایسی خلوت اختیار کی تھی کہ عرصہ تک محلہ سے بھی باہر نہ گئے تھے اعزہ واقارب سے بھی نہ ملتے کسی سے بات بھی نہ کرتے، میں نے کہا یہ خلوت چھوڑ دو اور گھر سے نکلو اور اعزہ واقارب سے ملو۔ اعزہ سے عزلت (۱) کب جائز ہے یہ تو قطع رحم ہے اور سفر کرو اور باغوں میں ٹہلا کرو ہوا خوری کے لیے دو چار کوس جایا کرو، تصوف کوئی قرنطینہ نہیں ہے (۲) کہ بس سارے کام چھوڑ کر ایک کنوئیں میں بیٹھ جاؤ اور ذکر میں بھی صرف اتنا جہر کرو کہ خود سن لو دوسروں کو سنانے کی کوئی حاجت نہیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، محلہ والے خوش ہوگئے اور دعا دیتے تھے کہ خدا بھلا کرے اس کا جس نے ان سے شور وغل چھڑایا ہم کو تو نیند بھی حرام ہوگئی تھی اور وہ ڈپٹی صاحب بھی تروتازہ ہوگئے۔ پیوست اور وحشت (۳) سب کافور ہوگئی اب خط آیا کرتا ہے لکھتے ہیں کہ الحمدللہ کام میں لگا ہوا ہوں۔

ذکر جہر میں اعتدال

اس قصہ سے افراط تفریط ابنائے (۴) زمانہ کی معلوم ہوتی ہے غرض ذکر جہر سے مقصود یہی ہے کہ اپنی آواز کان میں آتی رہے اور اس طرف توجہ ہونے سے خطرات نہ آئیں۔ اسی طرح ذکر لسانی (۵) سے قلب غافل بھی متنبہ ہوجاتا ہے تو ذکر لسانی بیکار چیز نہیں ہے بلکہ ذریعہ ہوجاتا ہے دونوں کے جمع کا اور ذکر قلبی کبھی ذریعہ ہوجاتا ہے دونوں سے خالی ہونے کا۔ لہٰذا محققین کہتے ہیں کہ ذکر لسانی ضرور کرو زبان سے ضرور کام کرو خواہ توجہ قلبی بھی نہ ہو کیونکہ اگر ایک وقت توجہ نہ ہوگی دوسرے وقت ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ ذکر قلبی اصل میں افضل سہی مگر ایک عارض سے زبانی کو ترجیح ہے اور وہ عارض یہ ہے کہ ذکر قلبی کی صورت میں بعض اوقات مطلق ذکر کے مفقود ہونے کا اندیشہ ہے اور لسانی

(۱) خلوت (۲) قید نہیں ہے (۳) خشکی و پریشانی سب ختم (۴) لوگوں کا ذکر کے بارے میں کمی بیشی میں مبتلا ہونے کا پتہ چلتا ہے (۵) زبانی ذکر کرنے سے غافل دل بھی متوجہ ہوجاتا ہے۔

میں کچھ نہ کچھ تو باقی رہتا ہے لیکن یہ معنی نہ سمجھ لیے جائیں کہ ذکر صرف زبان ہی زبان پر ہو اور دل میں اتنا بھی خیال نہ ہو جتنا نماز میں ارادہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھتا ہوں جیسے بعض جہلاء میں یہ آج کل ایک رواج ہو گیا ہے کہ کام کاج کر رہے ہیں باتیں کر رہے ہیں واہی تباہی بک رہے ہیں اور تسبیح چل رہی ہے سمجھ رہے ہیں کہ ہم ذکر کر رہے ہیں یا واہی تباہی میں تو مشغول نہیں زبان سے ذکر کر رہے ہیں مگر دل میں مقدمات کی تجویزیں ہیں حساب کتاب کی میزانیں لگا رہے ہیں، دور دور کی سوچ رہے ہیں یہ کیا ذکر ہے گو برکت سے خالی یہ بھی نہیں لیکن محض اس پر اکتفا کرنا تو ضرور قابل شکایت ہے ذکر لسانی کی تعلیم تو اس واسطے تھی کہ وہ ذریعہ بن جاتا ہے ذکر قلبی کا نہ یہ کہ بس یہی ہے جو کچھ ہے ذریعہ پر اکتفا کرنا اور مقصود پر نظر نہ ڈالنا ایسا ہے جیسے کسی کو چھت پر چڑھنا ہے اور اس کے لیے سیڑھی بنانا شروع کرے لیکن ساری عمر سیڑھی بنانے میں لگا رہے تو اس کا کیا حاصل ہے، وہ چھت کیا ہے، دل سے باوجود ذکر کا ترجمہ ہی، سو یاد ایسی ہوتی ہے جیسے بیوی کی یاد اور بچوں کی یاد کہ اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ بیوی کا نام ہر وقت لیتے رہیں یا بچوں کے نام ہر وقت لیتے رہیں بلکہ ایک دل کی کشش کا نام ہے کہ وہ ہر وقت رہتی ہے بچے کا نام لیتے بھی نہیں مگر یہ سوچا کرتے ہیں کہ اس کو یہ کھلائیں گے اور یہ پلائیں گے یہ سب اس کی یاد ہے یا جیسے گاؤں جائیداد کی یاد کہ وہ گاؤں خریدیں گے اس میں یوں ترقی کریں گے کہ خواہ زبان سے کبھی ظاہر بھی نہ کریں یہ ہے ذکر۔ مگر تعجب ہے کہ مخلوق کا ذکر تو ایسی یاد کو سمجھتے ہیں لیکن جب ذکر کو خدا تعالیٰ کی طرف مضاف کرتے ہیں تو اس کے معنی ہی پلٹ جاتے ہیں پس دوسری چیزوں کی یاد کے صحیح معنی تو سب لوگ جانتے ہیں مگر خدا کی یاد کے صحیح معنی بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ بس بڑی یاد یہ دیکھی کہ تسبیح لے کر اللہ اللہ کرنے لگے اور یہ خبر نہیں کہ دل کہاں ہے سو یاد یہ نہیں ہے یاد اور چیز ہے۔ میں اس کی حقیقت اور زیادہ سہل کر کے بتاؤں گا تا کہ ذکر سے وحشت نہ ہو کہ بڑی دشوار چیز ہوگی۔

تصوف کو ہوّا سمجھنا غلطی ہے

کیونکہ لوگوں نے آج کل تصوف کو ہوّا بنا رکھا ہے اسی واسطے اس کے نام سے

گھبراتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ہمارے بس کی چیز نہیں ہے۔ افسوس ایک نہایت حسین صورت کو ہڈو کا چہرہ(۱) پہنا دیا ہے شاید کوئی ہڈو کو نہ سمجھے تو وہ یہ ہے کہ مٹی کا نہایت مہیب چہرہ بناتے ہیں اور اس کو منہ پر رکھ کر بچوں کو ڈراتے ہیں اس پر امریکہ کا ایک قصہ یاد آ گیا کہ وہاں ایک روغن ایجاد ہوا ہے جو صندوقوں پر چڑھا دیا جاتا ہے اور اس میں صفت یہ ہے کہ جو کوئی اس کے پاس آتا ہے اس کی تصویر صندوق پر آجاتی ہے یہ ترکیب چور سے حفاظت کے لیے ایجاد کی گئی تھی کہ جو شخص چوری کرنے آئے اس کا پتہ لگ جائے مگر چور بھی امریکہ ہی کے تھے۔ انہوں نے یہ ترکیب ایجاد کی جب چوری کرنے لگے منہ پر ایک دوسرا منصوعی چہرہ چڑھالیا اور چوری کر لی۔ اس مصنوعی چہرہ کا عکس صندوق پر آ گیا۔ ہمارے یہاں بھی تصوف کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے کہ ایک نیا چہرہ نہایت مہیب اور بدشکل الفاظ یا رسوم کا چڑھالیا گیا ہے اس کا نام تصوف رکھ لیا ہے اس واسطے لوگ دور سے دیکھ کر ڈرتے ہیں اگر وہ چہرہ اتار دیا جائے تو وہ اس قدر حسین چیز ہے کہ ممکن نہیں اس کو دیکھ کر آدمی اس طرح کھینچ نہ جائے۔ بقول شاعر

از فرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست(۲)

تصوف سے ڈرنے والے اس کے اصل چہرہ سے روشناس نہیں

اور یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ تصوف سے ڈرنے والے اس کے اصلی چہرہ سے تعارف نہیں رکھتے اور اس کی ماہیت(۳) سے آگاہ نہیں کیونکہ مصنوعی چہرہ سے خوف جب ہی ہوتا ہے جبکہ آدمی اصل شخص کو پہچانتا نہ ہو اور اگر چہ اصل شخص کو پہچانتا ہو تو صرف اس کی وضع قطع سے بھی بتلادے گا کہ اگر چہرہ دوسرا چڑھا ہوا ہے لیکن یہ فلاں شخص ہے۔ بقول شاعر

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من از رفتار پایت می شناسم(۴)

تصوف تو ایسا حسین ہے کہ اس کا کوئی پہچاننے والا ہو تو ناخن پا سے(۵) بھی اس کو پہچان سکتا ہے۔ ناخن پا کے لفظ پر ایک قصہ یاد آ گیا ہے کہ حضرت وحشی رضی اللہ

(۱) مٹی کی ایک بدشکل صورت کا ماسک بنا کر چہرے پر چڑھالیتے ہیں (۲) ''سر سے پاؤں تک اور چوٹی سے لے کر ایڑھی تک جہاں بھی دیکھتا ہوں اس کی کشش دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے کہ ہر جگہ قابل دید ہے'' (۳) حقیقت (۴) ''حقیقت میں جس رنگ کا تُو لباس پہن لے گا میں تیرے پاؤں کی رفتار پہچان لوں گا'' (۵) پیر کے ناخنوں سے۔

تعالیٰ عنہ ایک صحابی ہیں ان کے ہاتھ سے قبل اسلام حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہوئی ہے بعد میں مسلمان ہوگئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو تم میرے سامنے نہ آیا کرو کیونکہ مجھے اپنے چچا کا واقعہ تازہ ہوجاتا ہے۔ یہ کتنی سخت سزا تھی کیونکہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عشق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دنیا کو معلوم ہے، ایسا محبوب عاشق سے یوں کہے کہ تم میرے سامنے نہ آؤ تو مرنا بھی اس کے واسطے سے زیادہ سخت نہیں مگر اللہ اکبر صحابہ کی اطاعت دیکھئے سچا عشق یہی ہے کہ عاشق محبوب کے امر کو اپنی خواہش پر مقدم رکھتا ہے۔ انہوں نے بالکل اس کا مصداق کر کے دکھلا دیا۔

اريد وصاله ويريد هجرى فاترك ما اريد لما يريد(۱)

اس کا ترجمہ کسی نے فارسی میں کیا ہے:

میل من سوے وصال ومیل اوسوے فراق ترک کام خود گرفتم ما برآید کام دوست (۲)

حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تعمیل ایسی کی کہ وہاں کی سکونت بھی چھوڑ دی اور ملک شام کو چلے گئے اور تمام عمر صورت نہیں دکھلائی۔ یہ مضمون تو استطر اداً(۳) بیان ہوگیا۔ اس قصہ سے مقصود یہ تھا کہ حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ملک شام میں ایک بزرگ پہنچے اور ان کا دل چاہا کہ ان سے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کا قصہ دریافت کریں اور یہ خیال امتحان کہ حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو پہچانتے ہیں یا نہیں منہ لپیٹ گئے۔ حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو کبھی بچپن میں کسی کی گود میں دیکھا تھا اور اب چہرہ ڈھکا ہوا تھا لیکن انہوں نے صرف پیر کے پنجہ سے پہچان لیا اور نام لے کر کہا کہ فلانے ہو جس کو کسی سے تعلق ہوتا ہے وہ ایسے ہی پہچان لیتا ہے۔ حسب شعر بالا

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من از رفتار پایت می شناسم (۴)

مگر لوگ آج کل مقصود کو پہچانتے ہی نہیں تصوف معلوم نہیں کس چیز کا نام رکھ لیا ہے ورنہ تصوف تو وہ چیز ہے کہ اگر بالمعنی الحقیقی ذہن میں ہو تو ہر آیت اور حدیث میں، اور

(۱) ''میں اس وصال چاہتا ہوں اور وہ میری جدائی چاہتا ہے، میں نے اپنی مراد کو ترک کر دیا تا کہ محبوب کی مراد پوری ہوجائے'' (۲) میرا میلان وصل کی طرف ہے اور محبوب کا خیال فراق کی طرف، میں نے اپنی مراد کو ترک کر دیا تا کہ محبوب کی مراد پوری ہوجائے'' (۳) ضمناً (۴) '' جس رنگ کا تُو لباس پہن لے گا میں تیری پاؤں کی رفتار کو پہچانتا ہوں''۔

ہر عاقل کے کلام میں بلکہ ہر عاقل کے افعال میں بھی وہی نظر آئے کوئی چیز اسکے لیے حجاب نہیں ہوسکتی اور پہچان نہ ہوتو بات ہی اور ہے۔ غرض الفاظ ورسوم کا پردہ تصور پر پڑا ہوا ہے اس واسطے میں الفاظ ورسوم کو چھوڑ کر یاد کی حقیقت آسان صورت میں سمجھاتا ہوں تاکہ بجائے وحشت کے اس سے محبت ہوجائے۔ دیکھئے ہم کسی محبوب کو یاد کرتے ہیں تو اگر پوری یاد ہوتو اس وقت اور چیزیں تو قلب میں کیا ہوتیں واللہ اس طرف بھی توجہ نہیں ہوتی کہ ہم فلاں شخص کو یاد کررہے ہیں اور اپنی یاد کی بھی یاد نہیں ہوتی صرف محبوب کی یاد ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ جب ہم کوئی کتاب دیکھتے ہیں اور غور سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس وقت ہمہ تن مضمون کتاب کی طرف ایسی توجہ ہوتی ہے کہ دل میں یہ بھی خطرہ نہیں ہوتا کہ ہم مطالعہ کررہے ہیں اس مطالعہ میں مطالعہ کا بھی خیال نہیں آتا۔ اسی طرح جب آپ دھوپ کو دیکھ رہے ہوں تو اس وقت یہ خیال نہیں آتا کہ ہم دھوپ کو دیکھ رہے ہیں۔ ان مثالوں سے یہ مضمون بہت ہی واضح ہوگیا کہ یاد وہ ہے جس میں اس یاد کی بھی یاد نہ رہے بس مذکور ہی کا دھیان رہے اسی کو فناء الفناء(۱) کہتے ہیں۔

ہمارے محاورات میں خود اس کا مفہوم شب وروز مستعمل ہے کسی کی یاد کو یاد اسی وقت کہتے ہیں جب یاد کی بھی یاد ذہن میں نہ رہے اور اگر یاد کی یاد ذہن میں ہوتو وہ اس چیز کی یاد نہیں بلکہ یاد کا خیال ہے۔ اب بتائیے کیا اس درجہ میں خدا کی یاد کی جاتی ہے یاد کے معنی وہی ذہن میں رکھئے جو حقیقت ہے یاد کی، پھر دیکھو کیا وہ یاد ہے۔ اول تو جب غیروں کا چرچا ذہن میں ہے تو یاد کہاں اور اکثر حالت ہم لوگوں کو یہی ہے کہ خدا کا نام لیتے ہیں اور دنیا بھر کے بکھیڑے اس وقت ذہن میں موجود ہوتے ہیں بلکہ اس وقت ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو دوسرے وقت ذہن میں نہ ہوتی ہوں۔ پھر کیا یہ خدا کی یاد ہے ہرگز نہیں۔ صاحبو! جب ایک ادنیٰ مخلوق کے ساتھ ہمارا یہ معاملہ ہے کہ جب ہم اپنے کسی محبوب کو یاد کرتے ہیں تو اس وقت دوسرا ذہن میں نہیں رہتا بلکہ یہ بھی ذہن میں نہیں رہتا کہ ہم اس کو یاد کررہے ہیں۔ بس اسی کی یاد ہے اور اس سے مزہ لیتے رہتے ہیں۔ یاد کی یاد دوست کی یاد نہیں تو حیرت ہے کہ خدا کی یاد اس طرح نہ کی جائے۔

(۱) اپنے مٹانے کو بھی مٹا دینا۔

ذکر کا اثر محسوس نہ ہونے کا سبب

صاحبو! ذرا اس طرح سے یاد کر کے دیکھو حق تعالیٰ کو پھر دیکھو کہ ذکر اللہ کیا چیز ہے اور اس میں وہ اثر ہے یا نہیں جو حدیث میں آیا ہے کہ شیطان قلب سے ہٹ جاتا ہے، ایک ہی دفعہ اللہ کہنے سے یہ اثر محسوس ہوگا مگر کیا کیا جائے کہ قلب میں یاد کی صلاحیت ہی نہیں، قلب زخمی ہو رہا ہے حالانکہ زبان سے بھی ذکر کیا جاتا ہے جو معین ہوتا ہے ذکر قلبی کا تو چاہیے تھا کہ اس کے ذریعے سے قلب زیادہ متوجہ ہو جاتا اور غیر سے خالی ہو جاتا مگر قلب میں چونکہ غیر ضرور رہتا ہے اسی واسطے ذکر کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ ایک دوست نے اس مقام پر ایک کام کا سوال کیا اس کو میں بیان کرتا ہوں اور اس کا حل بھی کروں گا۔ وہ سوال یہ ہے کہ عادۃً یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی ہر وقت خدا تعالیٰ کی طرف ایسی توجہ رکھے کہ اور کسی چیز کی طرف توجہ ہی نہ ہونے پائے حتی کہ اس توجہ کی طرف بھی توجہ نہ ہو۔

دل کی عجیب وغریب مثال

دل کی حالت تو موج کی سی ہے کہ ہر وقت زیروزبر ہوتا رہتا ہے۔ حدیث میں خود موجود ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شکایت کی کہ جب تک ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں رہتے ہیں تو گویا دوزخ جنت آنکھ کے سامنے ہوتے ہیں پھر ہم اہل وعیال میں مشغول ہو جاتے ہیں تو یہ حالت نہیں رہتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ حالت مستمر (۱) رہتی تو تم سے فرشتے مصافحہ کیا کرتے۔ ”ولکن یا حنظلة ساعة فساعة“ (۲) یعنی کبھی وہ حال ہوتا ہے اور کبھی یہ۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ذکر کا جس میں دوسری طرف توجہ بھی نہ ہو استمرار مامور بہ نہیں ہے (۳) بلکہ مقدور (۴) بھی نہیں، قلب کو تو قلب کہتے ہی اس لیے ہیں کہ اس میں تقلب ہوتا رہتا ہے یعنی لوٹتا پوٹتا رہتا ہے، غرض یہ کہ ذکر ہر وقت نہیں رہ سکتا۔ اس کا جواب سن لو، سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز کی طرف قلب کا ہر وقت متوجہ رہنا عادۃً ناممکن ہے اس کو ہم مانتے ہیں اور ہم خود کہتے ہیں کہ تم ایک ہی چیز دل میں نہ رکھو، مختلف چیزوں کو رکھو مگر وہ مختلف چیزیں ہوں اس ایک چیز کے تعلق کی، پس خدا تعالیٰ کی یاد

(۱) ہمیشہ رہتی (۲) الصحیح لمسلم، التوبۃ، ۱۲ (۳) ایسی توجہ کا حکم نہیں دیا گیا (۴) اس پر انسان قادر بھی نہیں۔

بھی خاص مختلف چیزوں کے ساتھ مجتمع ہوسکتی ہے یہ تو احتمال ہے باقی یہ مضمون قدرے شرح وتفصیل کا محتاج ہے جس کو ابھی عرض کرتا ہوں اور اس شرح کے لیے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ محبوب کی یاد جیسے یہ ہے کہ اس کا نام لیا جائے ایسے ہی یہ بھی اس کی یاد ہے کہ یہ تصور کیا جائے کہ اس کا چہرہ ایسا، ناک ایسی ہے، وہ ہاتھ ایسا ہے اور لباس ایسا ہے اور مکان ایسا ہے اور سواری ایسی ہے، اخلاق ایسے ہیں، عادات ایسی ہیں۔ یہ سب توجہ الی المحبوب اور ذکر محبوب ہی میں داخل ہے اسی مقام سے ایک عاشق کہتا ہے:

ہرچہ بینم در جہان غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو(۱)

صاحبو! ایسی تمام چیزوں کی طرف توجہ کہ جن کو علاقہ ہو محبوب سے اس محبوب کی یاد ہے۔ بشرطیکہ ان چیزوں کی طرف توجہ اسی علاقے سے ہو کہ یہ محبوب کی چیزیں ہیں اور یہ جو اوپر کہا گیا تھا کہ غیر کی طرف توجہ نہ ہو اس غیر سے مراد وہ چیز ہے جس کو محبوب سے علاقہ نہ ہو۔ صرف الفاظ پر نہ جایئے گو غیر بالمعنی المنطقی (۲) تو ہر چیز کو کہہ سکتے ہیں جو سوائے خدا تعالیٰ کے ہے مگر یہاں غیر سے مراد دوسرے معنی ہیں یعنی بے تعلق ہونے کی حیثیت سے میں نے پہلے بھی ایک وعظ میں بیان کیا تھا کہ صوفیاء کے کلام میں غیر اللہ کا لفظ معقولی اصطلاح (۳) کا لفظ نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی ذکر غیر اللہ ہو اور آپ پر ایمان بھی ایمان بغیر اللہ ہو۔ حالانکہ صوفیاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو غیر کہاں مانتے، وہ تو عالم کو بھی غیر اللہ نہیں کہتے جس سے ظاہر میں سننے والوں کو وحشت ہوتی ہوگی مگر یہ وحشت اس لیے ہے کہ آپ کے ذہن میں عین اور غیر کے وہ معنی جمے ہوئے ہیں جو اہل فلسفہ کی اصطلاح ہے ان کے یہاں عین اللہ کے معنی ذات بحت (۴) کے ہیں اور غیر وہ ہے جو ماسوائے ذات ہو(۵)۔ اس معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا عالم کو عین (۶) کوئی نہ کہہ سکتا اور صوفیاء نے جو کہا ہے تو ان کی اصطلاح اہل فلسفہ سے الگ ہے وہ غیر اس کو کہتے ہیں جسے خدا تعالیٰ سے تعلق نہ ہو یعنی جس چیز کو قرب حق میں دخل نہ ہو جیسے دنیائے مذموم (۷) اور معاصی وغیرہ، اور عین وہ ہے جس کو

(۱) ''تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے''(۲) منطقی اصطلاح میں (۳) منطقی اصطلاحات کا لفظ نہیں ہے(۴) خالص اللہ کی ذات کے ہیں (۵) جو ذات الٰہی کے علاوہ ہو(۶) ذات خدا(۷) ناپسندیدہ دنیا اور گناہ۔

خدا تعالیٰ سے تعلق ہو یعنی وہ قرب میں دخل رکھتا ہو اس معنی کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخ بلکہ تمام عالم کی ہر چیز جو خدا سے غافل نہ کرے بلکہ خدا کی یاد میں اعانت کرے کیونکہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا کمال قدرت معلوم ہوتا ہے(۱) عین ہے جس کے وہی معنی ہیں کہ اس کو قرب حق میں دخل ہے یہ معنی نہیں کہ یہ سب خدا ہیں (نعوذ باللہ) یہ معنی جب لازم آتے جب صوفیاء عین کا اطلاق منطقی اور فلسفی اصطلاح کے موافق کرتے مگر ان کی تو اصطلاح ہی جدا ہے ناواقفوں نے تصوف کی کتابوں میں لفظ عین دیکھ کر اس کی شرح میں نہ معلوم کیا کیا خبط کیا ہے(۲) جس کو زبان پر لاتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے اور یہ ساری خرابی غلط اصطلاح کی ہے کہ عین کا لفظ اہل تصوف سے سن لیا اور بدون (۳) ان کی اصطلاح کے سمجھے ہوئے ایسی واہی تباہی باتوں سے اس کا نام کر دیا۔ افسوس کیسے عالی مفہوم (۴) کو خلط اصطلاح (۵) سے خراب کیا ہے یہ بڑی خیانت ہے کیونکہ قرآن وحدیث معقولی اصطلاح (۶) میں نازل نہیں ہوئے پھر صوفیاء کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اپنے الفاظ میں معقول کا اتباع کریں۔ ہاں قرآن وحدیث محاورات اہل لسان میں نازل ہوئے ہیں تو غیر کے معنی میں بھی صوفیاء نے ان ہی محاورات کا اتباع کیا ہے چنانچہ غیر اور عین کے معنی صوفیاء کی اصطلاح میں وہی ہیں جن کو عامہ اہل لسان اپنے کلام میں روز مرہ برتتے ہیں۔

محاورات میں غیر اور عین کے معنی

چنانچہ کہتے ہیں کہ آپ تو اپنے ہی ہیں غیر تھوڑا ہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں غیر کے معنی معقولی نہیں ہیں یہ تھوڑا ہی مراد ہے کہ متکلم ومخاطب ایک دوسرے کے عین ذات ہیں بلکہ سیدھے سیدھے معنی ہیں کہ ہم اور آپ بے تعلق نہیں ہیں بلکہ ہم سے اور آپ سے تعلق خصوصیت کا ہے۔ غرض محاورات میں بے تعلق چیز کو غیر کہتے ہیں اور جس کو تعلق ہو اس کو غیر نہیں کہتے اور عالم (۷) کا تعلق حق تعالیٰ سے ظاہر ہے اور وہ تعلق یہ ہے کہ حق تعالیٰ صانع اور عالم منصوع ہے (۸) اور عالم دلیل ہے اور حق تعالیٰ مدلول (۹) تو جب

(۱) بنی ہوئی چیز دیکھ کر بنانے والے کی قدرت کا علم ہوتا ہے۔ اس لیے مصنوع کا دیکھنا بھی عین صانع کو دیکھنا ہی ہے (۲) غلطیاں (۳) ان کی اصطلاح کو سمجھے بغیر (۴) زبردست مفہوم کو (۵) اصطلاحات میں خلط کرنے سے غلطی ہوئی (۶) منطقی اصطلاحات میں (۷) دنیا (۸) اللہ بنانے والے ہیں اور دنیا اللہ کی بنائی ہوئی ہے (۹) دنیا کی تمام اشیاء اللہ کے وجود کی دلیل ہیں۔

عالم اس اصطلاح کی موافق حق تعالیٰ کا غیر یعنی بے تعلق نہیں ہوا تو اگر اس کو کسی نے دوسرے لفظ میں ترجمہ کر دیا اور عین کہہ دیا اور اس کے معنی سے کہے کہ عالم غیر متعلق باللہ نہیں ہے تو اس میں کیا ظلم ہو گیا اور کفر و شرک کدھر سے ہو گیا۔ یہ ان کی خاص اصطلاح ہے جو بالکل محاورہ کی موافق ہے اور اصطلاح میں کسی کو مناقشہ (۱) کا حق نہیں ہے خصوص وہ اصطلاح جو محاورہ کی موافق ہو البتہ بعض جاہلوں نے اس لفظ کے ایسے واہیات معنی کیے ہیں جو بالکل الحاد اور زندقہ ہیں۔ اصطلاحات کے خلط سے ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں حالانکہ صوفیاء کی اصطلاح معلوم ہو جانے کے بعد بالکل سیدھے سیدھے معنی ہیں۔

اہل اللہ جہلاء سے نہیں الجھتے

مگر اہل اللہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں وہ ایسے معترضین سے تعرض (۲) ہی نہیں کرتے وہ معترضین ان پر فتویٰ بھی لگا دیں تو پرواہ نہیں کرتے وہ جس خیال میں ہیں ان کو اسی سے فرصت نہیں وہ تو ایسے لوگوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں:

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی (۳)

ان کی حالت کیمیا گر (۴) کی سی ہے کہ کیمیا گر کبھی اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا اور اس کو اس بات پر کبھی غیظ و غضب (۵) نہیں آتا کہ اس کو کوئی کیمیا گر نہ سمجھے بلکہ وہ کوشش کرتا ہے کہ مجھے لوگ ہرگز نہ پہچانیں اور جو جس کا جی چاہے حکم لگاتا پھرے۔ خلاصہ یہ کہ غیر کے معنی بے تعلق چیز کے ہیں اور جس چیز کو تعلق ہو وہ غیر نہیں تو ان چیزوں کی طرف متوجہ ہونا جو کہ محبوب سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب توجہ الی المحبوب (۶) ہی ہے اور حق تعالیٰ سے تمام عالم کو تعلق ہے تو جس کی نظر میں یہ تعلق مستحضر ہے اس کی توجہ ہر چیز کی طرف الی اللہ ہی ہے تو اب اس شعر کے معنی صاف ہیں:

ہرچہ بینم در جہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو (۷)

بعض لوگ اس تقریر سے خوش ہوئے ہوں گے کہ بس اب تو ہمارا وہ ذکر بھی

---

(۱) جھگڑنے کا (۲) الجھتے نہیں (۳) ''مدعی سے عشق و مستی کے راز نہ بتایئے بلکہ چھوڑ دیجئے کہ وہ خود پرستی کے رنج میں مرجاتا ہے'' (۴) تانبے سے سونا بنانے والے کی سی ہے (۵) غصہ (۶) محبوب ہی کی طرف توجہ ہے (۷) ''یعنی تمام عالم اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے''۔

کامل ہوگیا جس میں ہمارا دل دنیا کے قصوں میں بارا باٹ [1] رہتا ہے کیونکہ جب عالم کی ہر چیز کی طرف توجہ کرنا توجہ الی اللہ ہی ہے تو ہمارا بیوی بچوں کی طرف دھیان کرنا بھی توجہ الی اللہ ہی ہے پھر ہمارے ذکر کو خاص کیوں کہا جاتا ہے تو میں اس شبہ کا پہلے جواب دے چکا ہوں کہ اشیاء عالم کی طرف توجہ ہونا محبوب کی طرف توجہ اس وقت ہے جبکہ وہ توجہ اس علاقہ سے ہو کہ یہ محبوب کی چیزیں ہیں یعنی توجہ کے وقت یہ علاقہ مستحضر وملحوظ ہو اور آپ کی توجہ ذکر کے وقت بیوی بچوں کی طرف اس علاقہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس علاقہ سے ہوتی ہے کہ وہ آپ کی چیزیں ہیں اپنی چیز سمجھ کر آپ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس توجہ میں خدا تعالیٰ کا علاقہ ملحوظ نہیں بلکہ خود کا علاقہ ملحوظ ہے [2] اور خود ہی مانع ہے خدا سے اور جو مانع ہے وہ غیر ہے اس لیے آپ کی توجہ غیر ہی کی طرف توجہ ہے۔

توجہ الی المحبوب کے تین درجات

تفصیل اس کی یہ ہے کہ توجہ الی المحبوب کے تین درجے ہیں توجہ الی الذات اور توجہ الی الصفات اور توجہ الی الافعال۔ اور ذات تو ظاہر ہے اور صفات بھی ظاہر ہیں اور افعال جیسے یہ خیال کرنا کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا یہ سب توجہ الی الحق ہی ہے اور اس سے شعر کے معنی اور زیادہ صاف ہوگئے یعنی اس میں توئی سے مراد مرتبہ ذات ہے اور خوئے تو سے مراد صفات ہیں اور بوئے تو سے مراد افعال ہیں۔ پس ان سب کی طرف توجہ حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ ہے اب سب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عالم کے ہر جزو کی طرف توجہ کرنا بھی توجہ الی اللہ ہوسکتی ہے کیونکہ کم از کم اس کے افعال کے ساتھ تو ہر وقت ہی تعلق ہوگا۔ حتی کہ اس نیم کے درخت کو اس نظر سے دیکھیں کہ محبوب کے تصرف سے اس کی شاخیں ایسی ہیں یوں پھل آتا ہے یوں پتے پیدا ہوتے ہیں، ذائقہ پھل کا اور ہے اور پتوں کا اور، خصوص بھی ہر جزو کے علیحدہ ہیں یہ بھی توجہ الی غیر اللہ نہیں ہے بلکہ نیم معرفت ہے کیونکہ مفضی الی معرفۃ الافعال ہے اور اگر اس طرح دیکھیں کہ اس کو خدا تعالیٰ نے بنایا ہے یعنی مصنوع سے ذات صانع کی طرف انتقال کریں تو پھر نیم نہیں بلکہ پوری معرفت ہے۔

(۱) اس جانب کا استحضار ہو (۲) اللہ سے تعلق کا لحاظ نہیں بلکہ اپنے تعلق کا لحاظ ہے۔

عارف کا عالَم سے تعلق کس قسم کا ہوتا ہے

عارف کا تعلق عالم کے ساتھ اور ہی طرح کا ہوتا ہے اس کو مصنوعات کے ساتھ تعلق رکھنے سے بھی ترقی ہوتی ہے کیونکہ وہ درحقیقت تعلق بالصانع ہے(۱) وہ ہر چیز پر خدا کے علاقہ سے نظر کرتا ہے بدون اس علاقہ کے نظر ہی نہیں کرتا اس لیے ہر چیز سے اس کو ترقی ہوتی ہے اور اسی علاقہ سے کبھی عارف کو اپنی ذات سے بھی محبت ہوجاتی ہے وہ اس وقت اپنی ذات کو سرکاری چیز سمجھتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی حفاظت کرے جیسے خزانچی کہ سرکاری روپیہ کا محافظ ہے تو اس کو روپیہ کی دیکھ بھال رکھنا اور اس کے دھندے میں لگا رہنا اور جانچ پڑتال کرتے رہنا برا نہیں بلکہ ضروری ہے اور اس کو طمع یا حرص نہیں کہہ سکتے یہ تو اس کا عین فرض منصبی ہے۔ یہ باریک بات ہے لوگ اہل اللہ کو دنیا کے تعلقات میں دیکھ کر اپنے تعلقات پر قیاس کر لیتے ہیں حالانکہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے جیسے اس خزانچی کے بار بار روپیہ شمار کرنے میں اور ایک بنئے کے شمار کرنے میں بڑا فرق ہے۔ خزانچی کو تو اجر ملتا ہے اور بنئے کو اجر نہیں ملتا بلکہ اور کچھ سرکاری ٹیکس مقرر ہوجاتا ہے کیونکہ خزانچی تو اپنے واسطے نہیں گنتا اور بنیا اپنے واسطے اپنا مال سمجھ کر گنتا ہے۔ جب آدمی کو یہ معلوم ہونے لگے کہ ہم اپنے نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہیں (اور اس کے لیے کچھ خاص علامات ہیں) تو اس کو اپنے آپ سے بھی محبت کرنا چاہیے اور جب تک یہ حال پیدا نہ ہو تو اپنی چیز سے بھی تعلق تعلق بغیر اللہ ہے اسی حالت عدم تعلق میں کہا ہے:

بخدا رشکم آید زچشم روشن خود کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے(۲)

مطلب یہ ہے کہ میری آنکھ بحیثیت میری آنکھ ہونے کے یعنی جب تک میری ہے آپ کے دیکھنے کے قابل نہیں اور جب آپ کی ہوجائے تو اس حالت کا یہ حکم ہے:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است(۳)

---

(۱) بنانے والے ہی سے تعلق ہے (۲) ''خدا کی قسم مجھے اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ایسے حسین سے میری نظر دور رہتی ہے'' (۳) ''مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہنچتے ہیں ہر گھڑی اپنے ہاتھوں کو ہزار بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے''۔

اس مرتبہ میں آنکھ کی طرف توجہ اور اس کی حفاظت کی تدابیر کرنا توجہ الی غیر اللہ نہیں بلکہ سرکاری چیز کی حفاظت ہے اور توجہ الی اللہ ہی ہے۔ یہ فرق اہل اللہ کے دنیوی تعلقات میں اور ہمارے دنیوی تعلقات میں گو صورۃً دونوں متشابہ ہیں (۱)۔

عالم میں مراۃ حق بننے کی استعداد ہے

یہی معنی ہیں اس آیت کے : وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۔(۲) شکایت فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ بہت سی نشانیاں عالم میں ایسی ہیں کہ لوگ ان پر نظر ڈالتے چلے جاتے ہیں اور ان کی طرف توجہ نہیں کرتے یعنی ان کو آیات اللہ اور مراۃ حق (حق کا آئینہ) نہیں بناتے۔ معلوم ہوا کہ اگر ان کو مراۃ حق بنانا چاہتے تو بنا سکتے تھے کیونکہ شکایت امور اختیاریہ ہی میں ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ عالم میں قابلیت مراۃ حق بننے کی ہے بنانے والا چاہیے۔ پس ثابت ہوا کہ عالم کی طرف توجہ اس حیثیت مذکورہ سے مذموم نہیں بلکہ محمود (۳) اور مطلوب ہے کیونکہ اس کے خلاف پر یعنی اعراض پر شکایت کی گئی ہے۔ ہاں جانچ لیا جائے کہ آیا یہ حیثیت حاصل بھی ہے جب طبعاً وذوقاً یہ بات پیدا ہو جائے کہ

حسن خویش از روئے خوباں آشکار کردہ پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہ (۴)

تو پھر اس کے لیے ہر چیز میں نظر کی اجازت ہوگی اور توجہ الی العالم اس کے لیے توجہ الی اللہ ہی ہوگی۔

حسینان جہان میں مراۃ ہونے کی استعداد نہیں

یہاں سے کوئی یہ خیال کرلے کہ جب تمام عالم مراۃ حق بن سکتا ہے تو من جملہ اجزاء عالم کے حسینان جہاں بھی ہیں تو ان کی طرف بھی نظر کرنا اس نیت سے کہ ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے درست ہونا چاہیے۔ سو یہ خیال محض غلط ہے کیونکہ حسینوں کو دیکھ کر خدا ایسا یاد آتا ہیکہ حسینوں کی یاد بھی ضرور اس میں شریک رہتی ہے اور شرکت بھی ایسی شرکت کہ غالب انہیں کی یاد ہوتی ہے اور خدا کی یاد مغلوب ہوتی ہے اور ایسی

(۱) سورۂ یوسف: ۱۰۵ (۲) صورۃ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں (۳) پسندیدہ (۴) ''تو نے اپنی خودی کو خوبصورتی کے چہروں سے ظاہر کر دیا ہے مگر عاشقوں کی نظر میں تماشا بن گیا ہے''۔

مغلوب کہ یہ صرف نفس کا دھوکہ ہی ہوتا ہے کہ اس میں خدا کی یاد بھی شامل ہے ورنہ یاد خدا اس وقت محض موہوم بلکہ معدوم ہوتی ہے اور اعتبار غالب ہی کا ہوتا ہے تو حسینوں کی طرف توجہ توجہ بخدا نہیں ہے اور اگر کوئی یہ بھی کرے کہ نظر کرتے وقت غلبہ خدا ہی کی یاد کو دے دے تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس میں بھی نفس کا دھوکہ ہی ہے وہ اس وقت من سمجھوتہ(۱) کر لیتا ہے کہ میں شہوت کا خیال نہ کروں گا بلکہ خدا کو یاد رکھوں گا پھر دیکھنے میں کیا حرج ہے اور اس طرح سے جال میں پھنسا دیتا ہے پھر اس میں یہ خاصیت ہے کہ زرا دیر کے بعد اس کا عکس ہو جاتا ہے اور انہیں کی یاد رہ جاتی ہے، یاد خدا کا پتہ بھی نہیں رہتا۔

لہٰذا نظر بہ حسن حرام ہے(۲) جبکہ اس کی طرف وہ خاص کشش ہو جو شہوت سے ناشی ہوتی ہے(۳) جس کے معیار کے لیے صحیح بصیرت کی ضرورت ہے ہر شخص کا فیصلہ اس کے لیے کافی نہیں اور وہ معیار یہ ہے کہ اگر اس حسین میں کوئی ایسا عیب پڑ جائے جس سے وہ قبیح المنظر(۴) ہو جائے تو دیکھا جائے کہ اس کی محبت گھٹتی ہے یا بڑھتی ہے اگر گھٹ جائے تو یہ علامت ہے اس محبت میں شہوت کی شرکت کی اور اگر بڑھ جائے تو علامت ہے خلوت عن الشہوت(۵) کی اور کسی محل میں دونوں محبتیں جمع ہو جاتی ہیں وہاں دونوں آثار مختلف حیثیتوں سے جمع ہوں گے جیسے اپنی بی بی میں کوئی ایسا عیب پڑ جانے کے وقت..... اگر اس جواب کے بعد بھی کوئی یہی کہے کہ حسینوں کی طرف نظر کرنا نظر بخدا ہے کیونکہ حسن دیا ہوا تو خدا ہی کا ہے تو ان کو دیکھ کر صنعت(۶) خدا پر نظر پہنچے گی لہٰذا جائز ہونا چاہیے تو اس کے لیے ایک دوسرا جواب ہے وہ یہ کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس سے صنعت خدا کا نظارہ ہو سکتا ہے مگر اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی محبوب نے اپنے سامنے دس آئینے کھڑے کیے ہوں جس میں اس کا عکس دیکھا جا سکے لیکن ایک آئینہ ان میں سے آتشی بھی ہے(۷) اس سے محبوب نے منع کیا ہے کہ اس میں مجھے نہ دیکھنا کیونکہ اس میں خاصیت ہے جلا دینے کی جیسا کہ آفتاب کو معمولی شیشہ میں دیکھیں تو آنکھ کو چنداں صدمہ نہیں پہنچتا اور آتشی شیشہ میں دیکھیں تو گو اس میں بھی وہی نور آفتاب کا ہے مگر اس کی خاصیت یہ ہے کہ جس

(۱) دل کو بہلا لیتا ہے (۲) حسن کی طرف نظر کرنا حرام ہے (۳) شہوت کی وجہ سے ہوتی ہے (۴) دیکھنے کے قابل نہ رہے (۵) شہوت سے خالی ہونے کی (۶) خدا کی کاری گری (۷) میگنی فائن گلاس۔

چیز پر اس کا عکس پڑ جائے گا جلادے گا تو یہ حسین بھی جمال حق کے لیے آئینے بیشک ہیں مگر آتشی شیشے ہیں کہ نور حق کا جب ان میں ہوکر پڑے گا تو جلانے کا اثر رکھے گا۔

ہرگز نہ گندمی گوں لاتقربوا کہ زہرست حال پدربہ باد از ام الکتاب دارم
نداند صاحب دلاں دل بہ پوست وگرا بلھے داد بے مغز اوست(۱)

اور میں کہتا ہوں کہ محبوب نے جب خود اپنی تجلیات کے مشاہدہ کے لیے اس شیشہ کے سوا دوسرا طریقہ اس سے اچھا اور بے خطر بتایا ہے تو خطرناک طریقہ کو اختیار کرنا کیا عقل کی بات ہے۔ یہ حسین ان تجلیات کے سامنے کیا چیز ہیں ان میں ہوکر وہ تجلیات بالکل میلی اور دھندلی ہوجاتی ہیں ان کی طرف نظر کرنا علامت ہے اس کی کہ اصل تجلیات کی جھلک اس شخص پر نہیں پڑی ہے ورنہ آفتاب کے سامنے چراغ کو کون پوچھتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حسینان جہاں توجہ آتشی ہونے کی بناء پر خاص خاصیات عادیہ کے منظر خدا ہونے سے مستثنیٰ ہیں(۲) باقی تمام عالم منظر اور آئینہ خداوندی ہے(۳) تو ان کی طرف توجہ بھی توجہ بخدا کہی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ حیثیت منظریت کی ملحوظ رہے(۴)۔ اس تقریر سے کہ ہر صحیح منظر پر نظر اور توجہ محبوب ہی کی یاد ہے۔ اس سوال کا جواب ہوگیا کہ ذکر ایک چیز ہے اور ایک چیز کا استمرار عادۃ قلب میں نہیں ہوسکتا۔

ذکر اللہ کے مختلف طرق

جواب ظاہر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذکر خدا کے طرق بہت ہیں ایک سے جی اکتاوے تو دوسرے طریق سے ذکر کرو۔ ایک چیز ذہن میں نہ رہے مثلاً توجہ الی الذات نہ رہ سکے تو صفات کو سوچو اور یہ بھی نہ ہوسکے تو افعال کو سوچو ہر چیز میں قدرت خدا نظر آسکتی ہے مصنوعات میں غور کرو کہ یہ صنائع حق تعالیٰ نے رکھی ہیں اور اس سے بھی اکتاؤ تو بیوی بچوں میں رہو اور دل بہلاؤ۔ کام کرنے والا چاہے بیوی بچوں کو دیکھ کر

(۱) ''حسینوں کے قریب مت جاؤ کہ زہر ہے باپ کا حال میں ام الکتاب میں رکھتا ہوں، صاحب دل اپنا دل چھلکے کے بدلے نہیں دیتے، دوسرے بیوقوف بغیر مغز کے اسے دے دیتے ہیں'' (۲) حسینوں کے چہروں میں چونکہ مثل آتشی شیشہ کے جلانے کی صفت ہے اس لیے مظہر خدا ہونے سے اس کو مستثنیٰ قرار دیا جائے گا (۳) باقی سارا عالم مظہر صفات خداوندی ہے (۴) بشرطیکہ اسی حیثیت سے دیکھائے کہ یہ مظہر صفات خداوندی ہے۔

بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ آخرت میں اعمال صالحہ کی بدولت اسی طرح کہ حوریں ملیں گی اور برے اعمال کرنے سے ان سے محرومی ہوگی اور بجائے ان کے عذاب بھگتنا پڑے گا۔ غرض اتنے طریقے خدا کی یاد کے ہیں کہ ساری عمر بھی آدمی اس سے اکتا نہیں سکتا اور یہی حکمت ہے اس میں کہ شریعت نے مختلف اوقات میں مختلف عبادتیں مقرر کی ہیں کبھی نماز ہے کبھی روزہ ہے کبھی زکوٰۃ ہے کبھی حج کبھی قربانی کبھی جہاد۔

مختلف اوقات میں مختلف دعاؤں کی حکمت

اور اسی طرح شریعت نے ہر وقت کے لیے جدا جدا خاص خاص دعائیں سکھلائی ہیں، اٹھنے کی دعا الگ اور بیٹھنے کی دعا الگ اور سونے کی الگ۔ اور جاگنے کی الگ اور کھانے سے پہلے کی الگ اور بعد کی الگ اور پینے کی الگ اور یہ سب اسی یاد کے طریقے ہیں اور اس تعدد طرق سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دل اکتائے نہیں۔ غرض محبوب نے تم کو ہزاروں آئینے دیے ہیں کہ خواہ اس کو دیکھو خواہ اس کو دیکھو۔

آئینہ میں محبوب کو دیکھو

مگر دیکھو محبوب ہی کو آئینہ کو مت دیکھو۔ دل میں وہی رہے اس سے غفلت نہ ہو پس یہ ایسا ہوا کہ ہم کبھی دوست کے خط کو دیکھتے ہیں اور کبھی اس کے کپڑوں کو اور کبھی اس کی صورت کو کبھی سیرت کو اور یہ سب دوست ہی کی یاد ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کو مختلف رنگوں سے یاد کرو، اپنی ضروریات میں بھی رہو اور حق تعالیٰ کو بھی مت بھولو۔ میں دنیا کے کاموں سے منع نہیں کرتا بڑی شکایت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ وقت بہت ضائع کرتے ہیں، دنیا کے ضروری کام اتنے نہیں کہ حق تعالیٰ کی یاد کو مانع ہوں۔ واللہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور جو شخص غور کرے گا اپنے اوقات میں وہ میرے قول کو صحیح صائب کہے گا کہ ہم دنیا کے ضروری کام بہت تھوڑی دیر کرتے ہیں۔ ضروریات کے لیے بہت ہی تھوڑی دیر توجہ قلب کی ضرورت ہے۔ زیادہ تر فضول باتوں میں قلب لگا رہتا ہے۔ بس میں ان فضول تعلقات کے چھوڑنے کو کہتا ہوں۔ یہ نہ دنیا کے کارآمد ہیں نہ دین کے اسی کو انہماک کہتے ہیں:

شریعت میں کسب دنیا کی اجازت ہے انہماک کی نہیں

شریعت میں دنیا کے کاموں کی اجازت ہے مگر انہماک کی اجازت نہیں۔ مثلاً پیشاب، پاخانہ ضروریات میں سے ہیں اور عقلاً ایک وقت ان کے واسطے دنیا کو بھی ضروری اور واجب قرار دیا گیا ہے مگر وہ وقت ان سے فراغت کرنے کے لیے دیا گیا نہ کہ عطر کی طرح اس کو سونگھنے اور لگانے کے لیے اسی طرح دنیا کے واسطے بھی وقت دینا چاہیے مگر اس سے فراغت کے واسطے نہ کہ دلچسپی کے واسطے۔ بس اس مثال کو پیش نظر رکھئے اور اسی درجہ میں دنیا کے کاموں میں لگئے۔ یہ اصلاح کا ایک چھوٹا سا گر ہے سوچ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ زیادہ وقت فضول کاموں میں جاتا ہے یا نہیں اگر فرضاً جوارح ظاہری(۱) بھی دین کے کام میں ہوں تب بھی قلب تو ضرور ادھر ادھر کے خیالات میں مصروف رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں ان فضول خیالات کی ضرورت ہی کیا ہے جس ضروری کام کو کرنا ہو اس کے متعلق جو سوچنا ہے تھوڑی دیر بقدر ضرورت سوچ لیجئے۔

قلب کو فارغ رکھنے کی ضرورت

اور اس کے بعد قلب کو فارغ کر لیجئے۔ ضروریات کے لیے ہاتھ پیر سے بھی کام لینے کی اجازت ہے اور قلب سے بھی پھر رفع ضرورت کے(۲) بعد قلب میں ضروری اور مفید خیالات رہنے دو اور فضول اور مضر خیالات کو نکال دو وہ ضروری اور مفید خیالات وہ ہیں جن کی نسبت حدیث میں ہے" اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ وَسَاوِسَ قَلْبِیْ خَشْیَتَکَ " حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا تعلیم فرمائی ہے کہ یا اللہ میرے دل کے خیالات کو اپنے خوف کے خیالات کر دیجئے بس تم بجائے فضول خیالات اور وساوس کے حق تعالیٰ کی نعمتوں اور وعیدوں کو سوچا کرو اور وعیدوں کو سوچنا یہ سب ذکر اللہ ہی ہے۔ لیجئے آپ کے لیے بہت سے میدان ہیں، دوڑنے میں تنگی کون کرتا ہے۔ بس یہ ہے یاد اور یہ ہے ذکر اللہ اسی کی ترغیب ہے اور اس کے مقابل یعنی غفلت سے منع کیا جاتا ہے۔ یہ ہے مضمون حدیث" اِذَا ذَکَرَ اللّٰہُ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ "(۳) کا۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ فہم اور ہمت اور توفیق عمل عطا فرمائے۔

(۱) اعضاء ظاہری (۲) ضرورت پوری ہونے کے بعد (۳) "جب وہ دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب ذکر اللہ سے غافل ہوتا ہے تو وہ وسوسہ ڈالتا ہے" تفسیر القرطبی: ۲۰/ ۲۶۲۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث میں دو عمل کی خاصیتیں بیان کی گئی ہیں ذکر اللہ کی خاصیت شیطان کا قلب سے ہٹ جانا اور غفلت کی خاصیت شیطان کا وسوسہ ڈالنا۔ مقصود ان دونوں کی خبر دینے سے ذکر کی ترغیب اور غفلت سے ترہیب ہے۔ (انتہی بلفظہ مولانا)

واقعہ۔۱: بعد ختم وعظ شیخ معشوق علی صاحب حضرت والا کو مسجد کے حجرہ میں لے گئے اور دروازہ بند کر دیا وہاں آرام فرمانے کے لیے ایک پلنگ پہلے سے تیار کر دیا گیا تھا دو ایک خادم بدن دباتے رہے اور تقریباً ایک گھنٹہ تک حضرت والا نے آرام فرمایا، ایک خادم مسجد میں ذکر کے لیے بیٹھ گیا، کچھ غنودگی سی ہوگئی، دیکھا کہ حضرت والا کے سامنے ایک پیالی چائے کی لائی گئی، فرمایا دودھ بھی لاؤ۔ میں جب چائے پیتا ہوں تو دودھ بھی پیتا ہوں اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ اس نے یہ خواب حضرت والا سے عرض کیا۔ فرمایا چائے سے مراد شورش اور دودھ سے مراد سکون معلوم ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ نہ صرف خیال کیونکہ خیال ہوتا تو اس کا عکس نظر آتا کیونکہ میں چائے نہیں پیتا ہوں اور کبھی پیتا ہوں تو دودھ کی نہیں پیتا۔ احقر کہتا ہے کہ وعظ القاف اس سفر کا سب سے اخیر وعظ ہے اور شروع کے وعظ میں ترہیب کے مضامین تھے جو شورش اور اضطراب پیدا کرنے میں چائے کے مشابہ تھے اور اخیر کے مواعظ میں ترغیب کے مضامین ہیں جو سکون ولذت پیدا کرنے میں دودھ کے مشابہ ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہر دو اثر کی صورت مثالیہ دکھائی گئی ہو۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ سامعین اور ناظرین کو دونوں اثروں سے مستفیض فرماویں اور رجاء خوف دونوں کو پورا کر کے ایمان کی تکمیل فرماویں۔ آمین۔ محمد مصطفی بجنوری ضابط وعظ عفی عنہ۔

واقعہ۔۲: احقر ظفر احمد (۱) نے دوسرا روز ہے کہ ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر میں تردد تھا (۲)، اتفاق سے آج اس وعظ پر نظر ثانی کرتے ہوئے وہی مضمون اس میں نظر سے گزرا جس سے حقیقت واضح ہوگئی۔ خواب یہ ہے کہ میں مولوی محمد یوسف مرحوم (برادر حکیم محمد مصطفی صاحب بجنوری ضابطہ وعظ ہذا) اور مخدومی استاذ مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب فرمانے لگے کہ

(۱) شیخ الحدیث علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب اعلاء السنن (۲) جسکی تعبیر واضح نہیں ہو رہی تھی۔

بھائی لوگ میرے اوپر نظر کے معاملہ میں اعتراض کرتے ہیں مگر الحمدللہ میں نے کسی پر نفس کے لیے نظر نہیں کی مجھے تو اسے بھی معرفت میں ترقی ہوتی تھی۔ مولوی یوسف صاحب کو اس بات پر بہت جوش آیا وہ فرمانے لگے کہ نظر الی الحسین (۱) سے ترقی ہو ہی نہیں سکتی اور اس میں یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ نفس کی آمیزش نہیں اور واقع میں نفس کی آمیزش ضرور ہوتی ہے اس پر مولانا محمد یحییٰ صاحب تو خاموش ہوگئے میں نے مولوی یوسف صاحب سے عرض کیا کہ بیشک نظر میں دھوکہ ہوجاتا ہے اور اکثر حالت یہی ہے مگر یہ ناقصین کی شان سے کاملین کو اس میں دھوکہ نہیں ہوتا اور وہ نفس کی آمیزش (۲) سے محفوظ رہتے ہیں۔ پس آپ کا مطلقاً یہ کہنا درست نہیں کہ نظر الی الحسین (۳) سے ترقی ہو ہی نہیں سکتی اور اس میں نفس کی آمیزش ضروری ہے۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا یا مولانا محمد یحییٰ صاحب نے فرمایا کہ بھائی آج کل تو عزلت (۴) ہی بہتر ہے اسی میں سلامتی ہے۔

اس وعظ سے اس خواب کی پوری تائید ہوتی ہے چنانچہ اس وعظ میں آتشی شیشہ کی مثال سے پہلے مذکور ہوا کہ نظر بحسن حرام ہے (۵) جبکہ اس کی طرف شہوانی کشش ہو۔ اس میں فیصلہ اسی معیار سے ہوتا ہے جو اس مقام پر مذکور ہے۔ باقی کوئی خود معیار ہی کے انطباق میں دسیسہ نفسانیہ (۶) سے کام لے اس کا کچھ علاج نہیں اس معیار کے بعد قضیہ شرطیہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بشہوت کشش نہ ہو تو وہ حرام نہیں مباح ہے (۷) اور مباح سے جبکہ وہ مقدمہ طاعت ہوجائے ترقی ممکن ہے مثلاً اگر اس سے معرفت میں کام لیا جائے اور اگر وہ کشش ہے جس میں شہوت کی بھی آمیزش ہو تو وہ حرام ہے اور اس سے معرفت تو کیا الٹا حجاب و بعد ہوتا ہے (۸) ہذا واللہ اعلم بالصواب ۱۲ ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۲ صفر سنہ ۱۳۴۳ھ ہے۔ اشرف علی

(۱) حسین کو دیکھ کر (۲) ملاوٹ (۳) آپ کا عمومی طور پر یہ حکم لگانا کہ حسین کو دیکھنے سے ترقی ہو ہی نہیں سکتی درست نہیں (۴) ان سے دور رہنا ہی بہتر ہے (۵) حسین کے حسن کو دیکھنا حرام ہے جبکہ شہوت کی کشش سے دیکھے (۶) اس معیار کو منطبق کرنے ہی میں وسوسہ کا شکار ہو (۷) جائز ہے (۸) اللہ سے دور اور بعد ہوتا ہے۔

فقط خلیل احمد تھانوی

۶۔۱۲۔۲۰۱۸

اخبار الجامعہ

محمد منیب صدیقی : ادارۃ أشرف التحقیق۔ جامعہ دار العلوم الاسلامیۃ۔ لاھور

1۔ جامعہ کے قدیم اور نہایت محترم استاد اور سابق امام مسجد سراج قاری خلیق بیگ صاحبؒ 18 فروری بروز پیر قضاء الٰہی سے انتقال فرما گئے (اناللہ وانا الیہ راجعون)۔ قاری صاحبؒ کی خدمات جامعہ کے لئے بہت ہی پرخلوص رہیں اور ان کی رحلت سے جو خلا جامعہ میں آ گیا ہے وہ ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ قاری صاحبؒ کے درجات بلند فرمائے اور انکے پسماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔

2۔ بحمداللہ تعالیٰ جامعہ دار العلوم الاسلامیہ دین کی تبلیغ اور نشر واشاعت میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہے اور اب یہ سلسلہ پاکستان کی حدود سے باہر بھی باقاعدہ نشر کیا جارہا ہے، جامعہ کا فیس بک پیج اور یوٹیوب چینل بھی بنادیا ہے جس پر شیخ الحدیث حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ کے بیانات اور جامعہ کے موجودہ مہتمم حضرت قاری احمد میاں تھانوی صاحب دامت برکاتہم کے بیانات نشر کئے جارہے ہیں۔ پاکستان کے طول وعرض میں سینکڑوں افراد جامعہ کی خدمات سے مستفید ہورہے ہیں ایسے ہی اب یہ سلسلہ ملک سے باہر بھی ان شاء اللہ جاری رہے گا۔ اللہ تعالی استقامت نصیب کرے۔ آمین

3۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ کی شہرہ آفاق تصنیف تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری کی آٹھویں جلد اللہ کے فضل وکرم، معاونین کی دعاؤں اور ادارہ اشرف التحقیق کے افراد کی ان تھک محنت سے مکمل ہوگئی ہے اور طباعت کے مراحل میں ہے جو بہت جلد منصۂ شہود پر آجائے گی ان شاء اللہ۔

4۔ اللہ رب العزت کے بیش بہا انعامات کے ساتھ ایک اور انعام کا اضافہ گذشتہ چند ماہ میں ہوا، تحدث بالنعمت کے طور پر عرض کررہا ہوں اللہ رب العزت جامعہ کے اعزازات اور افتخار میں مزید اضافہ فرمائے۔ گذشتہ تین ماہ میں حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم (مہتمم جامعہ ہذا) کے ہاتھ پر کل 15 افراد نے اسلام قبول کیا جن میں 13 کا تعلق مسیحی برادری سے تھا اور 2 افراد چائنہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان بھائیوں کو دین مبین پر استقامت نصیب فرمائے۔

5۔ رواں ماہ روایت حفص اور میٹرک کی تعلیم مکمل کرنے والوں کی تعداد کل 64 تھی جنہوں نے جامعہ کے امتیاز کو برقرار رکھا اور دونوں تعلیمی نظام ساتھ پڑھ کر اپنی تعلیم کا پہلا مرحلہ مکمل کیا، اس موقع پر مولانا فضل الرحیم صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور، مولانا ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی صاحب مہتمم جامعہ ہٰذا، مفتی عبدالقدوس ترمذی صاحب مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال، ڈاکٹر عبداللہ صالح صاحب پروفیسر جامعہ پنجاب اسلامک سنٹر نے طلباء کو خراج تحسین پیش کیا۔

6۔ اس سال درس نظامی مکمل کرنے والے 40 طلباء میں سے 37 نے گریجویشن، 25 نے ایم اے بھی ساتھ مکمل کیا، جامعہ کے دیگر طلباء میں سے 75 بی ایڈ، 14 نے ایل ایل بی، 125 نے ماسٹرز، 21 نے ایم فل، 7 پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ کا شمار ان چند تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے جس میں ایک وقت میں تین تعلیمی نظام ایک ساتھ پڑھانے میں جامعہ اپنی مثال آپ ہے۔

7۔ جامعہ کے جن طلباء نے گزشتہ سال میٹرک کا امتحان پنجاب بورڈ سے دیا تھا ان میں سے گیارہ لڑکوں نے حکومت سے سکالرشپ حاصل کرتے ہوئے فی کس 75 ہزار روپے حکومت سے وصول کئے۔

8۔ جامعہ حقانیہ کا ترجمان رسالہ "الحقانیہ" اس مرتبہ حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ کی زندگی اور دینی خدمات پر مشتمل ایک خاص نمبر "عارف ربانی نمبر" شائع کر رہا ہے جو جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ کے بھرپور اشتراک سے الحمدللہ مکمل ہو گیا ہے۔ اور بہت جلد طباعت کے مراحل سے گذر کر متعلقین اور حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ کے چاہنے والوں کے ہاتھوں میں ہوگا ان شاء اللہ۔

9۔ 3 مارچ 2019ء کو جامعہ میں مولانا مشرف علی تھانویؒ کی جامعہ کے لیے کی گئی خدمات کے اعتراف ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے جس میں اندرون و بیرون ملک سے علماء کرام شرکت فرمائیں گے۔

10۔ 17 مارچ 2019ء بروز اتوار تکمیل بخاری شریف کی تقریب ہوگی مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم آخری سبق پڑھا کر تکمیل فرمائیں گے۔